جلد ۸۹ جولائی ۱۹۷۸ء عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۹	جولائی ۱۹۷۸ء مطابق شعبان ۱۳۹۸ھ	عدد ۵

اشارات:	جناب نعیم صدیقی صاحب	۲
مقالات:		
نبوت کی حقیقت اور اس کی ضرورت و اہمیت	جناب گوہر رحمٰن صاحب	۹
اولاد اور والدین کے باہمی حقوق	ڈاکٹر احمد عمر صاحب	۱۸
حضرت شیخ احمد سرہندی کے خلاف الزامات	جناب الیمار عالم صاحب	۲۲
اسلام کا انسانِ مطلوب	جناب اسعد گیلانی صاحب	۲۹
رسائل و مسائل	جناب ملک غلام علی صاحب	۳۴

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک - اچھرہ - لاہور

فون نمبر ــــ ۴۱۱۰۱۶ ــــ ۴۱۱۰۱۷

زرِ سالانہ بیس روپیہ - فی پرچہ ۲/- روپے

ابوالخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

چیف مارشل لا ایڈ منسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق کی تازہ تقریر کے پیچھے بھی حسب سابق ایک مخلصانہ جذبہ ضرور کارفرما ہے، مگر مسائل اتنے پیچیدہ ہیں اور مختلف مشوروں کی بوچھاڑ ان پر ہر چہار جانب سے اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ تازہ تقریر میں فکر کے کئی خطوط ایک دوسرے کو کاٹتے ہوئے بھی دکھائی دیتے ہیں۔

مثلاً ان کا ایک ارشاد یہ ہے کہ:

"اسلامی زندگی کا آئین جو ۱۴سو سال پہلے نافذ ہوا تھا، آج بھی نافذ ہے۔ اسے کسی نے منسوخ نہیں کیا۔ نہ ہی کسی ایک فرد یا گروہ کے ہاتھوں دوبارہ نافذ ہونے کا محتاج ہے۔"

"اگر یہ نظام منسوخ ہو چکا ہوتا تو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کے فرائض منسوخ ہو چکے ہوتے۔"

اس معنی میں تو اسلام برصغیر میں انگریزی حکومت کے سائے میں بھی نافذ تھا کہ اسلام کو یا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کو کبھی منسوخ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ قادیانیوں کے سربراہ اول نے انگریزی حکومت کی اطاعت اور اس سے تعاون کو شرعاً لازم قرار دیا۔ اس وقت بھی اگر اسلام کو بالفعل نافذ قرار دیا جائے تو تحریک مجددی سے لے کر تحریک خلافت تک جتنی بھی احیائے اسلام کی تحریکیں یہاں چلیں، ان سب کا مقصد و مدعا از سرِ نو طے کرنا پڑے گا۔ بلکہ خود تحریکِ پاکستان کا بھی کوئی نیا مقصد تجویز کرنا لازم ہوگا۔ کیونکہ اگر تحریکِ پاکستان کا نصب العین اسلام، اسلامی قانون اور اسلامی تہذیب کا

احیاء تھا تو پہلے سے نظام اسلامی کے نفاذ کا نظریہ بدلنا پڑے گا۔

کیونکہ:

"کچھ لوگ سرے سے اسے اپنی عملی زندگی سے تقریباً خارج کر چکے تھے"......اور

جو اس پر عمل پیرا ہیں وہ بھی زیادہ تر اس کی مقرر کردہ عبادتوں پہ اکتفا کرتے ہیں"۔

"اور اس کا سماجی، اقتصادی اور معاشرتی پہلو پس منظر میں چلا گیا ہے"۔

اسلام کا عملی زندگی سے خارج ہو جانا اور اس پر عمل پیرا ہونے والوں کا بھی محض چند عبادتوں پہ عمل پیرا ہونا ایک ایسا بیان ہے جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے اسلام کا بڑا حصہ، خصوصاً سماجی اور اقتصادی امور، عملاً نافذ نہیں رہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ اسلام کا بہت بڑا حصہ ایسا ہے جسے عملاً نافذ کرنے کے لیے ایک نئی کوشش کی ضرورت ہے۔ اس نئی کوشش کی کچھ ذمہ داریاں فرد پہ بھی آتی ہیں، علماء اور مصلحین امت پر بھی آتی ہیں، اور حکومت وقت پہ بھی عاید ہوتی ہیں

یہاں پہنچ کر اس جملے کا مفہوم متعین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ:

"نہ ہی کسی ایک فرد یا گروہ کے ہاتھوں (اسلام) دوبارہ نافذ ہونے کا محتاج ہے"۔

یہ جملہ تو فرد اور گروہ دونوں کو سبکدوش کر دیتا ہے کہ تمہارے ذمے اسلام کے اجرا و نفاذ کے سلسلے میں کوئی بارِ فرائض نہیں ہے؟

اب شروع سے یہاں تک کے اجزائے کلام کو زیر غور لا کر دیکھیے کہ بات کیا بنی؟

ہمارے یہاں بہت سے لکھنے اور بولنے والوں کے طرز بیان سے یہ مغالطہ عام ہو گیا ہے کہ اسلام حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آیا اور نافذ ہوا۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اسلام حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ انسانیت تک پہنچا، آپؑ کے ہاتھوں سے نافذ ہوا، اور پھر جب بھی وہ عملاً زندگیوں سے خارج ہوا یا دوسرے غلط رجحانات اس میں خلط ملط ہو گئے اور علمی و دعوتی لحاظ سے اس میں تحریف ہو گئی تو پھر کسی نئے رسول و نبی نے تجدید و احیاء کا کام کیا۔ حضور خاتم النبیین کے بعد مجددینِ اُمت اور علماء و صلحا نے بار بار اسے تعلیمی و فکری لحاظ سے

واضح شکل میں پیش کیا اور عملاً یہ کوشش کی کہ اس کے احکام اور ادارے بحال ہو جائیں۔

اسی معنی میں ہمارے ہاں ایک اصطلاح اقامتِ دین کی رائج ہے جس کی بنیاد قرآن کے اس مطالبے پر ہے کہ "اقیموا الدین" (الشوریٰ - ۱۳) دوسری اصطلاحیں تجدید دین اور احیائے دین کی متداول ہیں جن کی بنیاد احادیث پر ہے۔ بلکہ ایک اور اصطلاح محی الدین کی بھی اسلامی لٹریچر میں شائع و ذائع ہے جو احیائے دین کے تصور پر مبنی ہے۔ ان ساری اصطلاحوں کا مطلب یہ ہے کہ دین جب کبھی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں پر اپنا غلبہ کھو بیٹھے، دینی حقائق واضح نہ رہیں، صحیح اور غلط خیالات گڈمڈ ہو جائیں تو ہر صاحبِ ایمان و شعور فرد کا، اور ہر دینی گروہ کا اور اسلام کے لیے کام کرنے والی ہر حکومت کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ وہ دین کی دعوت دے، دین کے اصول و حقائق کو شکوک و اوہام اور بدعات و منکرات کے گھیروں سے نکالے، اور عملاً دین کے عقائد و عبادات، احکام و قوانین اور آداب و شعائر کو غالب کرنے کی سعی کرے۔ اسی لیے کسی کو صدی کا مجدد اور کسی کو ہزار سال کا مجدد قرار دیا جاتا ہے۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کو محی الدین کا لقب دیا گیا ہے۔ یہی الفاظ مشہور بادشاہ اورنگ زیب کے لیے بھی استعمال ہوئے۔

قرآن نے "اقیموا الدین" کے مطالبے کو دوسرے لفظوں میں بھی بیان کیا ہے، حضورؐ کی بعثت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ "لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ" یعنی ان کے ذمے یہ خدمت ہے کہ وہ خدا کی ہدایت یا دینِ حق کو دوسرے تمام ادیان و مسالک کے مقابلے میں عملاً غالب کر دیں۔

غلبۂ دین اور اقامتِ دین کی سعی کا یہی فریضہ امت کے ہر فرد اور مسلم معاشرہ کی ہر جماعت اور ہر حکومت پر عاید ہوتا ہے۔

ہمارے محترم جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو اس فریضہ سے بھی انکار نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

> "ہمیں جو ملکی قوانین ۱۹۴۷ء میں ورثے میں ملے تھے وہ ایک غیر ملکی اور غیر اسلامی حکومت کے وضع کردہ تھے .... موجودہ قوانین کو اسلام سے ہم آہنگ کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔"

پھر مثبت پہلو سے خود زور دیتے ہیں کہ:

"بنیادی طور پر چار شعبوں میں کام کرنے کی ضرورت ہے: سماجی، اقتصادی، تعلیمی اور تعزیری"۔

لیکن پھر پلٹ کر وہ یہ فرماتے ہیں کہ:

"ان شعبوں میں خاص طور پر سماجی شعبے میں اسلام پر عمل کرنے کے لیے کسی قسم کے سرکاری احکامات کی ضرورت نہیں ہے۔ ضابطۂ اخلاق پہلے سے موجود ہے۔ اگر سوا سات کروڑ افراد اپنی روزمرہ زندگی میں پانچ وقت کی نماز کی عادت ڈال لیں اور عملی زندگی میں اسلامی ضابطے کو اپنا لیں تو عملی طور پر اسلامی نظام خود بخود نافذ ہو جائے گا"

یہ بات کچھ ایسی ہی لگتی ہے جیسے کوئی ہیلتھ افسر بیان دے کہ اگر لوگ صفائی کے پابند ہو جائیں، خراب غذائیں کھانا چھوڑ دیں، ہوا خوری اور ورزش کی عادت ڈالیں تو صحتیں خود بخود برقرار رہ جائیں گی۔

انسان کی سماجی و اخلاقی زندگی کی بڑی مشکل یہ ہے کہ یہاں خود بخود کچھ نہیں ہوتا، بلکہ اصلاح کی ہر بات کے لیے کسی نہ کسی کو اٹھ کر اس کے لیے آواز بلند کرنی پڑتی ہے، لوگوں کو قائل کرنا ہوتا ہے۔ پھر تربیت سے ان میں عادت پیدا کرنی ہوتی ہے۔ دوسری طرف ایسی تدابیر بھی سوچنی پڑتی ہیں کہ گھروں، تعلیم گاہوں اور پورے معاشرہ کے عمومی ماحول میں ایسے محرکات موجود نہ رہیں جو غلط سمت میں لے جاتے کے لیے دباؤ ڈالتے ہوں بلکہ بالکل برعکس صورت میں ایسے عوامل پیدا کیے جائیں کہ بچوں اور بڑوں کو صحیح سمت میں بڑھنے کے لیے آسانیاں پیدا کریں۔

نظریاتی طور پر جب مسلمانوں کے لیے شراب یا چوری کو حرام کیا گیا ہے تو شراب یا چوری کو مسلم معاشرے میں خود بخود ختم ہو جانا چاہیے، مگر ایسا عملاً تو ہوتا نہیں۔ تعمیری اصلاح کی کچھ مساعی تعلیم، ترغیب، ترہیب اور تربیت سے کی جاتی ہیں، مگر ساتھ کے ساتھ شراب اور سرقہ کا قانونی انسداد بھی کیا جاتا ہے، اور جو لوگ نہ تعلیم و تلقین کے ذرائع سے اثر قبول کریں اور نہ قانون کے خوف سے غلط حرکات سے باز رہیں، اُن کو سزا بھی دینا پڑتی ہے۔ یعنی اسلام کی اصلاحی اسکیم کا ایک سرا اگر تعلیم و تلقین ہے تو دوسرا تہدید و تعزیر۔ یہ دونوں تدابیر مل کر ہی صحیح نتیجہ پیدا کرتی ہیں۔ ایک کوشش،

دوسری کے بغیر ادھوری رہ جاتی ہے اور ناقص اور کمزور نتائج دیتی ہے۔

اس مفروضے کے حق میں کوئی ایک تاریخی مثال بھی نہیں مل سکے گی کہ کسی معاشرہ کے پورے کے پورے یا بیشتر افراد نے یہ جان کر خود بخود نماز شروع کر دی ہو کہ اس کا حکم خدا نے دیا ہے۔ دعوت دینے والی قوت دیر تک کام کرتی ہے، مخالفِ نماز محرکات و موانع کو روکتی ہے۔ ترغیبی عوامل کو بڑھاتی ہے، اور کم سے کم سرکاری اداروں اور دفتروں میں اقامت صلوٰۃ کے حکم کو ضابطۂ ملازمت کا جز بنا کر افسران کو اس کے نفاذ کا ذمہ دار بناتی ہے اور اس معاملہ میں ان کی کارکردگی کے مطابق ریمارکس اُن کے فائلوں پہ درج کرتی ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں آنے اور ترقی پانے والے افراد کا ریکارڈ بسلسلہ اقامت صلوٰۃ دیکھ کر اور اہم مناصب پہ آنے والوں کے حلف میں اقامتِ صلوٰۃ کے وعدے کو شامل کرا کے وہ معاشرے کو نماز کا پابند بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

اس طرح کی بھرپور محنت کے بغیر ایک ایسے معاشرے کے کروڑوں افراد میں نماز کی ترویج کیسے ہو سکتی ہے جس میں لوگ سمجھتے ہوں کہ نماز کے بغیر بھی مسلمان اچھا خاصا مسلمان رہتا ہے اور تارکِ نماز ہوتے ہوئے بھی وہ مسلمانوں کی نمائندگی اور قیادت کر سکتا ہے اور بڑے سے بڑے عہدے پہ فائز ہو سکتا ہے۔

یہی صورتِ حال تمام دوسری خوبیوں کو پھیلانے اور خرابیوں کو مٹانے کی ہے۔

اسلامی نظام اصل میں چند متفرق اجزاء کا نام نہیں کہ فلاں کام پہلے افراد خود کر لیں اور اس کے نتیجے میں فلاں کام خود بخود ہو جائے گا، بلکہ یہ سارا ایک ہی مربوط کُل ہے۔ اسے نافذ یا غالب یا عملاً قائم کرنے کا عمل بیک وقت مختلف اطراف سے شروع کرنا ہوگا ہے۔ تعلیم کی جانب سے بھی، اقتصادیات کی اطراف سے بھی، سماجی پہلوؤں سے بھی، علمی و فکری دائرے میں بھی، نشر و ابلاغ کے ذرائع سے بھی، دفتری نظام کے واسطے سے بھی، اور دیگر تمام دوائر سے بھی۔

نظام کی تبدیلی کا کام ——— خواہ وہ کتنی ہی پُرامن اور تعمیری و فلاحی نوعیت رکھتی ہو — ایک جنگی کارروائی کی طرح سے ہوتا ہے۔ جتنی سپاہ کو اس کے لیے ترتیب دی جا سکتی ہو اسے

کمانڈر میدان میں اتارتا ہے اور ایک نقشۂ جنگ سامنے رکھ کر زور و شور سے اپنی کارروائیاں انجام دیتا ہے۔ یہ گرما گرم رزمی کام اگر بزم آرائی کی شکل اختیار کرے تو بات نہیں بنتی - یہ تو ایک نوعیت کا جہاد ہے۔

جس طرح فوجی کارروائی کے لیے اسکیم (SCHEMING) ضروری ہوتی ہے، اس طرح تیز رفتار کارروائی (QUICK ACTION) بھی لازمی ہوتا ہے۔ پھر جس طرح فوجی اقدام ہمہ جہتی (ALL ROUND) قسم کا ہوتا ہے۔ اسی طرح تبدیلیٔ نظام کا کام بھی ہمہ جہتی ہوتا ہے۔

ایسے بڑے اور جامع کام کے متعلق ہمارا یہ خیال کرنا صحیح نہیں کہ بس چند اجزا ہیں جن کو نسخے کے مطابق ایک ایک کر کے بوتل میں ڈالنا اور مکسچر تیار کرنا ہے، اور یہ تو اور بھی زیادہ پیچیدہ بات ہے کہ فلاں فلاں جز مل جائیں (یہ بھی ایک خواہشاتی طرز فکر ہے) تو باقی مکسچر خود بخود بن جائے گا۔ اور یہ سوچنا بھی صحیح نہیں کہ فلاں فلاں اصلاحات تو لوگ کر لیں، پھر فلاں کام حکومت کرے گی۔

حقیقت میں اسلام کے لیے کام کرنے کا جذبہ رکھنے والی حکومت کو تو احیائے اسلام کی مہم کی قیادت کرنی ہوتی ہے۔ افراد سے جو کام لینے ہوتے ہیں اُن کے لیے بھی وہ محرکات فراہم کرتی ہے اور مزاحمتوں کا خاتمہ کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں افراد سے ان کے رضاکارانہ جذبے کو اُبھار کر لیے جانے والے کاموں کو بھی احیائے اسلام کی پوری اسکیم میں رکھنا ہوتا ہے۔ جیسے آپ اقتصادی ترقیاتی منصوبہ میں پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر کے متعلق اپنے نقشے کے مطابق حالات کی نشوونما کا انتظام کرتے ہیں۔

محترم جنرل صاحب کا یہ نکتہ بہت واضح ہے، اور یہ پچھلے بعض جملوں سے پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کو رفع بھی کرتا ہے کہ:

"حکومت کے ذمے ایسے قوانین بنانا ہے جن کا تعلق افراد کی زیادہ تر اجتماعی زندگی سے ہوتا ہے"۔

فرد کی زندگی کا بہت بڑا حصہ اجتماعی دائرے میں ہوتا ہے، اور بقیہ حصہ بھی اجتماعی دائرے کے

احوال سے متاثر ہوتا ہے۔ لہٰذا اجتماعی زندگی کے لیے جو قانون سازی کی جائے گی وہ افراد کی انفرادی اور نجی زندگیوں کو بھی اپنے رنگ میں رنگتی جائے گی۔

اگر سابق قوانین کو بدلنے اور اسلام کے مطابق افراد کی اجتماعی زندگی سے متعلق اسلام کے مطابق قانون سازی کرنے کا کام حکومت کے سر عاید ہوتا ہے تو پھر یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کسی فرد یا گروہ کے ہاتھوں اپنے دوبارہ نفاذ، یا قیام یا احیاء کے لیے محتاج نہیں۔

مجھے یہ عبارات پڑھ کر خیال ہوتا ہے کہ محترم جنرل صاحب کی نیت بالکل صاف ہے، البتہ جو بات وہ کہنا چاہتے تھے اس کو ترتیب دینے میں کہیں کوئی جھول رہ گیا ہے۔

ایک یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ:-

"ایسے قوانین مرتب کرنے ہیں جو مسلمانوں کے تمام فرقوں کے لیے قابلِ قبول ہوں"۔

یہ مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جن پر اسلامی قانون کے اجراء کے داعیان اور اس سلسلے میں کام کرنے والے محققین اور سیاسی ٹیموں اور مختلف فرقوں کے علماء نے برسوں سوچ بچار کی ہے۔ اب تک جو سوال اٹھے اور بحثیں ہوئیں اور پھر ان سے جو نتائج نکلے ان کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو یہ شرط پوری ہونا شاید ہی دائرہ امکان میں ہو کہ قانون صرف وہ جاری ہو جس پر حنفی اور اہلحدیث ہی نہیں، شیعہ برادران بھی متفق ہوں۔ چند مسائل کو تجربہ کے طور پر ان سارے مدارسِ فکر کے اکابر کے سامنے استفتا کے طور پر رکھیے اور دیکھیے کہ جوابوں میں کتنے بڑے فاصلے ہیں۔

۱۹۵۱ء میں جب تمام مدارس فکر کے جید و اکابر اور معتمد علیہ اور وسیع النظر علماء جمع ہوئے تھے تو انہوں نے اس بات پر سمجھوتہ کر لیا تھا کہ عام ملکی قوانین مسلم اکثریت کی فقہی تعبیرات کے مطابق بنیں گے، البتہ پرسنل لا کی حد تک کوئی بھی گروہ چاہے تو اپنی فقہ کے مطابق فیصلہ لے سکتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ محترم جنرل صاحب اس خاص مسئلے پر ایک بار پھر غور کریں۔

(باقی بر صفحہ ۴۲)

نبوت کی حقیقت اور اس کی ضرورت واہمیت

از جناب مولانا گوھر رحمٰن صاحب

(۲)

حکومت وسیاست سیاست کا مادّہ س، و، س ہے۔ ان حروف سے مصدر کا صیغہ "سَوْسًا" اور "سیاسۃ" آتا ہے۔ باب ہے: سَاسَ یَسُوْسُ بر وزن قَالَ یَقُوْلُ اس لفظ کا اساسی اور بنیادی مفہوم ہے اصلاح کرنا، کسی چیز یا قوم کی حالت سنوارنا اور اصلاحی تدابیر اختیار کرنا۔ اسی بنیادی مفہوم کو ملحوظ رکھتے ہوئے لفظ سیاست، سیادت، قیادت، امارت اور حکمرانی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

ابن منظور افریقی، ابن اثیر، صاحب تاج العروس شرح قاموس، امام نووی، بدرالدین عینی اور صاحبِ منجد سب نے اسی طرح لکھا ہے۔

سُسْتُ الرَّعِيَّةَ سِيَاسَةً وَسُوِّسَ الرَّجُلُ أُمُوْرَ النَّاسِ إِذَا مُلِّكَ أَمْرَهُمْ وَالسَّوْسُ الرِّيَاسَةُ۔ وَالسِّيَاسَةُ الْقِيَامُ عَلَى الشَّيْءِ بِمَا يُصْلِحُهُ۔[1]

(ترجمہ) میں اپنی رعیت کی قیادت کر رہا ہوں، فلاں شخص کو لوگوں کے معاملات میں سیاست دے دی گئی ہے یعنی اسے ان کا حکمران بنا دیا گیا ہے۔ سَوس (سیاست) ریاست اور حکومت کو کہا جاتا ہے۔ اور سیاست کا اصل مفہوم کسی چیز کی اصلاح کرنے کو کہا جاتا ہے۔

---

[1] لسان العرب۔ ج ۶۔ ص ۱۰۸۔ تاج العروس۔ ج ۴۔ ص ۱۶۹۔ نہایہ ابن اثیر ج ۲۔ ص ۱۹۲۔ (مادہ سوس) نووی شرح مسلم۔ ج ۲۔ ص ۱۲۶۔ کتاب الامارۃ عمدۃ القاری ج ۱۲۔ ص ۴۳۔ باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔

صاحب منجد لکھتے ہیں :-

اَلسِّيَاسَةُ اِسْتِصْلَاحُ الْخَلْقِ بِاِرْشَادِهِمْ اِلَى الطَّرِيْقِ الْمُنْجِيْ فِي الْعَاجِلِ اَوِ الْآجِلِ۔

(ترجمہ) سیاست مخلوق کی اصلاح کا نام ہے کہ اُن کو وہ طریقے بتائے جائیں جو ان کو مشکلات سے نجات دلاتے ہوں فی الحال یا مستقبل میں (یا دونوں حالتوں میں)۔

سَاسَ الْقَوْمَ سِيَاسَةً دَبَّرَهُمْ وَ تَوَلّٰى اَمْرَهُمْ[1]

(ترجمہ) فلاں شخص نے قوم کی سیاست اپنے ہاتھ میں لے لی یعنی وہ ان کے معاملات اور مسائل کے حل کا انتظام کر رہا ہے اور ان کا حکمران اور والی بنا دیا گیا ہے"۔

جدید طرز کی مادّہ پرستانہ سیاست میں اخلاق، تربیت اور تہذیب کے اصول شامل نہیں ہیں بلکہ یہ صرف جنگ اقتدار اور ہوسِ حکمرانی کا نام بن گئی ہے۔ لیکن حکمائے یونان اور دیگر فلسفیوں کے نزدیک علم سیاست اُن اصول و تدابیر کا نام ہے جن سے معاشرے کے افراد کی اخلاقی اصلاح اور انفرادی تربیت بھی ہوتی ہو اور اُن سے اجتماعی معاملات کے حُسن انتظام اور قیام عدل کا کام بھی لیا جا سکتا ہو۔ اس لحاظ سے علم سیاست میں علمِ اخلاق بھی شامل ہے اور حکمرانی بھی اس میں شامل ہے۔ بہترین اور معیاری سیاست دان وہی ہو سکتا ہے جو اعلیٰ ترین مُربّی اور معلّم اخلاق بھی ہو اور بہترین حکمران بھی ہو۔ اس قسم کا کامل حکمران اور قائد صرف خدا کا نبی ہی ہو سکتا ہے جس میں قیادت و سیادت کی صلاحیتیں فطری ہوتی ہیں اور جس کے قلب کا خفیہ تعلق براہ راست خالقِ کائنات اور حاکم حقیقی سے ہر وقت قائم رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دُنیا میں سب سے پہلا انسان یعنی آدمؑ خلیفہ اور قائد کی حیثیت سے تشریف لایا تھا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً - (البقرہ - ۳۰) "یقیناً میں پیدا کر رہا ہوں زمین اپنا نائب"۔

---

[1] المنجد ص ۳۶۲ - مادّہ سَوَس

علامہ آلوسیؒ (م ۱۲۷۰ھ) خلیفہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

اِنَّہٗ خَلِیفَۃُ اللّٰہِ فِی الارضِ وکذا کلُّ نبیٍ استخلفھم فی عمارۃ الارض وسیاسۃ الناس وتکمیلِ نفوسھم وتنفیذ امرہٖ[1]

(ترجمہ) حضرت آدمؑ خدا کا مقرر کردہ خلیفہ ہے۔ اس کی زمین پر اسی طرح ہر نبی کو اللہ تعالیٰ نے اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ زمین کی تعمیر، لوگوں کی سیاست و قیادت، ان کے تزکیہ نفس و تکمیل نفوس اور اپنے احکام و قوانین کے نفاذ کے لیے۔

حضرت عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ ابن مسعودؓ نے خلیفۃ اللہ کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

ای یَخْلُفُنِیْ فی الحکم بینَ خَلقِی وذَا الخلیفۃ آدم ومَن قَامَ مَقَامِہٖ فِی دینِ اللّٰہِ وَالحکمِ بَینَ خلقہٖ[2] (تفسیر ابن جریر البقرہ آیت ۳۰)

(ترجمہ) یعنی آدمؑ میری مخلوق کے درمیان فیصلے کرنے میں میرا خلیفہ ہے۔ یہ خلیفہ آدمؑ ہے اور ہر وہ شخص ہے جو نفاذ دین اور مخلوق کے درمیان فیصلے کرنے میں قائم مقام ہو۔

علامہ ابن اثیر (م ۶۳۰ھ) لکھتے ہیں:۔

وکان آدمُ مَعَ ما اَعطاہُ اللّٰہ تعالیٰ مِن مُلکِ الارض نَبِیًّا رَسُولًا الی ولدہٖ وانزل اللّٰہ علیہ احدی وعشرین صحیفۃ کتبھا آدمُ بیدہٖ علّمہ ایاھا جبریلؑ[3]

(ترجمہ) آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے زمین کی حکمرانی عطا فرمائی تھی اور اس کے ساتھ وہ اپنی اولاد کی طرف نبیؑ اور رسول بھی تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر ۲۱ صحیفے نازل فرمائے تھے جن کو انہوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا۔ اور ان صحیفوں کی تعلیم ان کو حضرت جبرئیلؑ نے دی تھی۔

آدم علیہ السلام کے بعد بنی نوع انسان کی ریاست و سیاست ان کے بیٹے حضرت شیث علیہ السلام کے

---

[1] روح المعانی۔ ج ۱۔ ص ۲۲۰۔ طبع لاہور۔

[2] تفسیر ابن جریر۔ البقرہ۔ آیت ۳۰۔

[3] الکامل لابن اثیر ج ۱۔ ص ۴۷۔ طبع بیروت ۱۹۶۵ء

سپرد ہو گئی تھی چنانچہ ابن جریر طبریؒ اور حافظ ابن کثیرؒ دونوں نے لکھا ہے:۔

وصارت الرِّياسة من بعد وفاة آدمؑ لشيثؑ فانزل الله عليه فيما روی عن رسول الله خمسين صحيفة۔[1]

(ترجمہ) اور ریاست و سیاست آدمؑ کی وفات کے بعد شیثؑ کو منتقل ہو گئی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر رسول اللہؐ کی ایک روایت کے مطابق ۵۰ صحیفے نازل فرمائے۔ شیثؑ کے بعد ان کی قوم کی قیادت ان کے صاحبزادے انوش کے سپرد ہوئی اور اس نے آدمؑ اور شیثؑ کے طرز پر قوم کی رہنمائی فرمائی۔

ابن جریر لکھتے ہیں:۔

وَقَامَ انوش بعد مضیٰ ابيه شيث لسبيله بسياسة الملك وتدبير من تحت يديه من رعيته مقام ابيه شيث ولم يزل على ما ذكر على منهاج ابيه لا يوقف منه على تغيير ولا تبديل۔[2]

(ترجمہ) شیثؑ کی وفات کے بعد ان کے صاحبزادے انوش نے ملکی سیاست اور رعیت کا نظم و نسق چلانے کے لیے اس کی جگہ لی اور ہمیشہ اپنے باپ کے طرز پر ثابت قدم رہے۔ ان سے کسی تبدیلی یا ترمیم و تغیر کی اطلاع نہیں مل سکی''۔

انبیاء بنی اسرائیل کے متعلق صحیح حدیث میں آیا ہے کہ ان کا کام ہی سیاست تھا:۔

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُولُ اللهِ كَانَتْ بَنُو اِسْرَائِيلَ تَسُوسُهُمُ الْاَنْبِيَاءُ كُلَّمَا هَلَكَ نَبِيٌّ خَلَفَهُ نَبِيٌّ وَاِنَّهُ لَا نَبِيَّ بَعْدِي وَسَيَكُونُ خُلَفَاءُ۔[3]

---

[1] تاریخ الامم والملوک لابن جریر الطبری۔ ج ۱، ص ۷۶۔ ذکر ولادة حواؑ۔

[2] تاریخ الامم۔ ج ۱، ص ۸۱۔

[3] بخاری۔ کتاب الانبیاء۔ باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔ مسلم۔ ج ۲۔ ص ۱۲۶۔ کتاب الامارة۔ باب الوفا ببیعت الاول فالاول۔

(ترجمہ) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کی سیاست اور انتظام ان کے انبیاء کے ہاتھ میں تھا جب بھی کوئی نبی وفات پا جاتے تو دوسرا نبی اس کی جگہ آ جاتا اور یقیناً میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا اور خلفاء آتے رہیں گے"۔

"تسوسھم" کی تشریح کرتے ہوئے ابن الاثیر، بدر الدین عینی اور امام نووی رحمہ لکھتے ہیں:۔

اے تتولی امورھم کما تفعل الامراء والولاۃ بالرعیۃ [1]

(ترجمہ) یہ انبیاء ان کے معاملات کا انتظام کیا کرتے تھے جیسا کہ حکمران اپنی رعیت کے معاملات کا نظم ونسق چلایا کرتے ہیں۔

شیخ عبد الغنی دہلوی (م ۱۲۹۵ھ) لکھتے ہیں:۔

(تسوسھم الانبیاء) من السیاسۃ وھی السیاسۃ التادیب علی الرعیۃ [2]

(ترجمہ) تسوس کا لفظ سیاست سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی ہیں حکمرانی اور رعیت کی تربیت"

مذکورہ بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ سیاست و حکومت درحقیقت خاصۂ نبوت ہے۔ نبی کے علاوہ دوسرا شخص یا گروہ اسی وقت حکمرانی کا جائز حقدار ہوتا ہے جب کہ وہ اپنے آپ کو خلیفۂ رسولؐ سمجھ کر اپنی سیاست و حکومت کو سنتِ رسول اور منہاجِ نبوت کے مطابق چلا رہا ہو ورنہ اس کی حکومت کی کوئی شرعی اور قانونی حیثیت نہیں ہوگی۔ پابند شریعت حکومت کا نام اسلامی اصطلاح میں خلافت ہے۔ اسی خلافت کو "سیاسۃ دینیۃ" یعنی اسلامی سیاست کہا جاتا ہے۔ علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں:۔

ملکی قوانین اور سیاسی اصول جب ملک و دولت کے "دانشوروں" اور لیڈروں کے وضع کردہ ہوں تو اس کو سیاستِ عقلیہ (یا وضعیہ) کہا جاتا ہے جو لوگوں کو سیاست دان کی ذاتی خواہشات اور اغراض پوری کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ لیکن جب قوانین اللہ کی جانب سے مقرر کردہ ہوں جن کو اس کا نبی (شارع) نافذ کرتا ہے تو یہ "سیاست دینیہ" ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کے لیے مفید ہے۔

---

[1] نہایہ ابن اثیر۔ ج ۲ ص ۱۹۲۔ عمدۃ القاری ج ۱۶ ۔ ص ۴۳۔ نووی شرح مسلم ج ۲۔ ص ۱۲۶۔

[2] انجاح الحاجۃ۔ حاشیہ ابن ماجہ۔ ص ۲۰۶ طبع کراچی۔

اسی کو خلافت کہا جاتا ہے جو لوگوں کو دُنیوی اور اُخروی دونوں زندگیوں کے مصالح اور فوائد حاصل کرنے کے لیے شریعت پر عمل کرنے کے لیے آمادہ کرتی ہے تو خلافت اصل میں صاحبِ شریعت (نبیؐ) کی نیابت ہے دین کی حفاظت اور دُنیا کی سیاست (اصلاح) کے کام ہیں۔[1]

حافظ ابن القیمؒ (م ۷۵۱ھ) فرماتے ہیں:۔

لَا نَقُوْلُ اَنَّ السِّيَاسَةَ الْعَادِلَةَ مُخَالِفَةٌ لِلشَّرِيْعَةِ الْكَامِلَةِ بَلْ هِيَ جُزْءٌ مِنْ اَجْزَآءِهَا وَبَابٌ مِنْ اَبْوَابِهَا۔[2]

"ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ عادلانہ سیاست شریعت کاملہ کی مخالف ہے بلکہ یہ تو اس کا ایک جزء اور ایک شعبہ ہے۔"

حافظ ابن القیمؒ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

"شریعت ایسی کامل ہے جس سے زیادہ کامل سارے جہاں میں کوئی دوسرا قانون نہیں ہے تو جو شخص یہ خیال رکھتا ہو کہ کسی اور سیاست کی ہمیں ضرورت ہے تو وہ شخص درا صل یہ خیال رکھتا ہے کہ ہمیں دوسرے رسول کی ضرورت ہے۔" (اس لیے کہ سیاست تو شریعت میں کامل طور پر موجود ہے گویا)[3]

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی خلافت کی تعریف میں لکھتے ہیں:۔

"معنی خلافت در لغت جانشینی است کہ یکے بجائے دیگرے بنشیند و بہ نیابت او کار کند و در شرع مراد از وے بادشاہ است برائے تصدی اقامت دین محمدی علی صاحبہ الصلوٰۃ والتسلیمات بہ نیابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم"[4]

(ترجمہ) خلافت کے معنی لغت میں جانشینی کے ہیں کہ ایک شخص کسی کا قائم مقام بنایا جائے جو نیابتاً اس کا کام انجام دے رہا ہو۔ اور اصطلاح شریعت میں اُس ۔ اسلامی حکومت کو کہتے ہیں جو رسول اللہؐ

---

[1] مقدمہ ابن خلدون فصل فی الخلافت ص ۱۶۵ - ۱۶۶ -

[2] اعلام الموقعین۔ ج ۴ - ص ۲۶۲ طبع مصر ۱۹۶۹ء -

[3] اعلام الموقعین۔ ج ۴ - ص ۲۶۴ طبع مذکورۃ الصدر

[4] ازالۃ الخفاء - ج ۱ - ص ۲۵۶ - مقصد اوّل - فصل ہفتم۔

کی نیابت کے طور پر اقامتِ دین (نفاذِ شریعت) کا کام کرتی ہو"۔

نائب رسول کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے کہ سیاست اور حکومت اصل میں نبی کا کام ہے۔ خلیفۂ رسول یعنی اسلامی نظامِ حکومت کا سربراہ تو مختارِ کُل اور مقتدرِ اعلیٰ نہیں ہوتا بلکہ کارِ نبوت یعنی اقامتِ دین کا کام منہاجِ نبوت کے مطابق انجام دینے کا پابند ہوتا ہے۔

سیاست اور قیادت کے لیے درج ذیل بنیادی اوصاف ضروری ہیں:۔

۱۔ نظم و نسق چلانے کی استعداد۔

۲۔ امن و امان قائم رکھنے اور ملک کو خطرات سے محفوظ رکھنے کی قابلیت۔

۳۔ اولوالعزمی، مضبوط قوتِ ارادی اور بہادری و فیاضی۔

۴۔ عدل و انصاف اور دلسوزی و ہمدردی کے جذبات کا موجود ہونا۔

۵۔ رعایا کی تنظیم کے ساتھ ان کی تربیت و تعلیم کے کامل نظام کی پوری استعداد اور قابلیت۔

۶۔ اور عام اخلاق و کردار کی برتری۔

یہ وہ صفات ہیں جن کے بغیر کوئی شخص قائد اور حکمران کہلانے کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک انسان تاج و تخت کا مالک تو ہو مگر ان اوصاف سے عاری ہو تو عقلاء اور حکماء اسے صرف صورت کا بادشاہ کہتے ہیں، حقیقت میں وہ قزاق، لٹیرا اور بندۂ نفس و ہوٰی ہوتا ہے۔ لیکن اگر کوئی انسان تاج و تخت، دولت و مال، شان و شوکت، فوج و لشکر اور شاہی محلات کا مالک تو نہ ہو، مگر مذکورہ صفات اور سیرتِ ملوک کا مالک ہو تو وہ اپنی درویشی میں بھی بادشاہ کہلاتا ہے۔ اس کی حکومت لوگوں کے دلوں پر قائم ہوتی ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے حکمرانی کے مذکورہ اوصاف علی وجہ الکمال موجود ہوتے ہیں۔

علم و حکمت صحیح علم اور حقیقی حکمت کے لیے چند امور کا موجود ہونا ضروری ہے۔ ان کے بغیر صرف نام کی حکمت اور برائے نام علم ہوگا۔ حقیقت میں جہل و سفاہت ہوگی۔

- جزم و قطعیت اور حقیقتِ نفس الامریہ کی ترجمانی
- خواہشاتِ نفس اور ماحول کے تاثرات سے پاک ہونا۔
- مصالحِ عالم کا سبب ہونا۔
- وحدتِ انسانیہ کا ضامن ہونا۔

انبیاء علیہم السلام کے علم و حکمت کا سرچشمہ وحی خداوندی اور علم الٰہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم قطعی اور حقیقت نفس الامریہ کے عین مطابق ہوتا ہے اور خواہشات و ماحول کے تاثرات سے بالکل پاک ہوتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ علم مصالح عالم، حقوق انسانیت اور وحدت انسانیت کا موجب ہوتا ہے، اس لیے کہ وہ سارے جہان کا یکساں مالک اور حاکم ہے۔ نبی کے قلب میں اسی آفاقی اور حقیقی حکمت کا بحر ذخار موجود ہوتا ہے۔

فلسفہ فلسفے کی بنیاد عقل انسانی پر ہے۔ افلاطون کی فلسفیانہ آمریت ہو یا ارسطو کی فلسفیانہ جمہوریت اشتراکی آمریت ہو یا یورپ کی سیکولر جمہوریت ہو۔ موروثی اور شخصی بادشاہت ہو یا نیشنلزم پر مبنی فاشزم ہو، ان سب نظاموں کی بنیاد علم انسانی اور عقل و تجربہ پر ہوتی ہے۔ اور عقل انسانی خدا کی بہت بڑی نعمت ہونے کے باوجود بہرحال خواہشات نفس اور ماحول کے تاثرات سے بالکل خالی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے عقلی علم و حکمت پر مبنی نظام ہر حال میں کامل نہیں ہو سکتا۔

انسانی عقل سب سے پہلے اپنی یا اپنی قوم اور اپنے قبیلے یا طبقے کی مصلحت کو مدنظر رکھتی ہے، اس لیے اس کا وضع کردہ نظام ساری انسانیت کے حقوق اور سارے جہان کی مصلحت کا ضامن ہرگز نہیں بن سکتا۔

تمام انسانوں اور دانشوروں کی سوچ یکساں نہیں ہو سکتی اور آج تک دنیا کے فلاسفہ بعض بنیادی حقائق میں بھی متحد نہیں ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ فکری انتشار معاشرتی اتحاد کا موجب کبھی نہیں بن سکتا۔ اس لیے عقلی حکمت کبھی بھی وحدت انسانیت کا عالمگیر منشور پیش نہیں کر سکتی۔

رشد و ہدایت صحیح قسم کی تربیت اور مرشد کامل کے لیے کم از کم درج ذیل اوصاف لازمی ہیں:

۱۔ فکر دنیا پر فکر آخرت کو ترجیح دینا اس لیے کہ اصلی زندگی آخرت کی زندگی ہے۔
۲۔ رضائے الٰہی کو اپنے تمام مشاغل کا نصب العین بنانا۔
۳۔ جسم و روح دونوں کے حقوق ادا کرنا لیکن روحانیات کو مادیات پر ترجیح دینا۔
۴۔ خدا، رسول اور دین اسلام کے ساتھ سب سے زیادہ محبت رکھنا۔
۵۔ الٰہی نظام کو انسانی نظاموں پر اور خیر کو شر پر غالب کرنے کے لیے جذبۂ جہاد۔
۶۔ استقامت اور صلابت (پختگی) فی الدین۔

۷۔ انسانیت کے مفاد کو ذاتی مفاد پر مقدم رکھنا۔

۸۔ اخلاقِ حسنہ۔ کمالاتِ رُوحانیہ اور اعلیٰ سیرت و کردار۔

تاریخ گواہ ہے کہ اس قسم کی تربیت انبیاء کرام ہی سے حاصل کی جاسکتی ہے یا پھر ان مربّی حضرات سے مل سکتی ہے جن کی تربیت گاہیں تعلیماتِ انبیاء کا نمونہ ہوں۔ دُنیا کے مُرشدین افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ راہبوں، جوگیوں، اشراقی فلسفیوں اور جاہل و غالی صوفیوں کے تربیتی مراکز میں نفس کشی، جسم آزاری اور ترکِ دُنیا کی تعلیم دی جاتی ہے اور مادّہ پرستوں کے نزدیک عیش و عشرت اور عیاشی و نفس پرستی ہی زندگی کا نصب العین ہے۔ لیکن انبیاء علیہم السّلام کی صحبت میں جن ہستیوں نے تربیت پائی تھی اُن کی زندگی میں جسم و رُوح کا اعتدال قائم تھا وہ شب خیز تھے، فرشتہ سیرت تھے، گھر سے علم کے مالک تھے، زندگی کو تکلّفات سے پاک رکھتے تھے، لیکن ساتھ ساتھ وہ روزی بھی کماتے تھے۔ خود بھی کھاتے تھے دوسروں کو بھی کھلاتے تھے۔ ان کے بیوی بچے بھی تھے اور وہ ان سب کا خیال بھی رکھتے تھے۔

(باقی)

اولاد اور والدین کے باہمی حقوق

از ڈاکٹر احمد عمر ہاشم صاحب

(۲)

(پہلی قسط ترجمان القرآن ماہ اپریل ۱۹۷۸ء میں چھپ چکی ہے۔ یہ دوسری اور آخری قسط ہے)۔

والدین کو اولاد کے ساتھ مساوی سلوک کرنا چاہیے۔ لڑکوں کے ساتھ لڑکیوں کے حقوق بھی پورے کرنے چاہییں۔ وراثت میں لڑکیوں کو وہ حصّہ دیا جائے جو اسلام نے اُن کے لیے مقرر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: یوصیکم اللہ فی اولادکم للذکر مثل حظ الانثیین (اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ مرد کا حصّہ دو عورتوں کے حصّہ کے برابر ہے)۔

عام معاملات میں اولاد کے ساتھ مساوی سلوک کی جو تاکید اسلام کرتا ہے اس کی ایک مثال یہ ہے:

نعمان بن بشیر روایت کرتے ہیں کہ میرے والد بشیر نے مجھے اپنے مال میں سے کچھ عطیہ دیا۔ میری ماں عمرۃ بنت رواحہ کہنے لگیں: "میں اس عطیہ پر اُس وقت تک راضی نہ ہوں گی جب تک آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ نہ کر لیا جائے۔" میرے والد آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بتایا کہ میں نے اپنے لڑکے نعمان کو یہ عطیہ دیا ہے۔ میرے والد نے آپؐ سے درخواست کی۔ آپؐ اس عطیہ کے گواہ رہیں۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا: "کیا نعمان کے اور بھی بھائی ہیں" میرے والد نے جواب دیا: ہاں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا: "کیا اُن میں سے ہر ایک کو اتنا عطیہ دیا ہے" تو میرے والد نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "پھر یہ بات درست نہیں ہے۔ اس عطیہ کو واپس لو۔ میں صرف حق بات کا گواہ بن سکتا ہوں۔ مجھے ظلم پر گواہ مت بناؤ۔ میرے سوا کسی اور سے

ایسی گواہی لو، اللہ سے ڈرو، اور اپنی اولاد کے ساتھ عدل کرو، تیری اولاد کا یہ تجھ پر حق ہے کہ تو اُن کے مابین عدل و انصاف سے کام لے۔ جیسا کہ اُن کا فرض ہے کہ وہ تیرے ساتھ مساوی حُسنِ سلوک کریں۔ کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ وہ تیرے ساتھ مساوی حُسنِ سلوک کریں"؟ اس نے جواب دیا: "بے شک"۔ آپؐ نے فرمایا: "تو پھر عطیات میں ناانصافی نہیں چل سکتی"۔ آپؐ نے حکم دیا کہ یہ عطیہ واپس لیا جائے (بخاری اور دوسری احادیث میں یہ روایت الفاظ کے اختلاف کے ساتھ مروی ہے)۔

دوسری طرف اسلام اولاد کو بھی یہ تعلیم دیتا ہے کہ والدین سے حُسنِ سلوک کریں۔ اور اُن کے مرتبے اور مقام کا لحاظ کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وقضیٰ ربک ان لا تعبدوا الا ایاہ وبالوالدین احساناً۔ اما یبلغن عندك الکبر احدھما او کلاھما فلا تقل لھما اف ولا تنھرھما وقل لھما قولاً کریماً واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا۔	تیرے رب نے فیصلہ کر دیا ہے کہ تم لوگ کسی کی عبادت نہ کرو مگر صرف اُس کی۔ والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو۔ اگر تمہارے پاس اُن میں سے کوئی ایک یا دونوں بوڑھے ہو کر رہیں تو انہیں اُف تک نہ کہو۔ انہیں جھڑک کر جواب نہ دو۔ بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو اور نرمی اور رحم کے ساتھ اُن کے سامنے جھک کر رہو اور دُعا کرو کہ اے پروردگار ان پر رحم فرما جس طرح انہوں نے رحمت و شفقت کے ساتھ مجھے بچپن میں پالا تھا۔

ماں چونکہ بچے کی پیدائش اور تربیت میں نسبتاً زیادہ تکالیف اٹھاتی ہے اس لیے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کی خدمت اور دیکھ بھال کی زیادہ تاکید فرمائی ہے۔ یہ روایت سب لوگ جانتے ہیں کہ الجنۃ تحت اقدام الامھات (جنت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے)۔ حضرت ابوہریرہؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا۔ اور اس نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ، من احق الناس بحسن صحابتی (اے اللہ کے رسول، میری حُسنِ معاشرت کا کون انسان سب سے زیادہ مستحق ہے)۔ آپؐ نے فرمایا: "تیری ماں"۔ اُس نے دریافت کیا: پھر؟

آپ نے فرمایا: "تیری ماں" اس نے پوچھا، پھر؟ آپ نے فرمایا: "تیری ماں"۔ چوتھی مرتبہ اس نے یہی سوال کیا تو آپ نے فرمایا: "تیرا باپ"۔

نیز آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "خاک آلود ہو اُس کی ناک، خاک آلود ہو اُس کی ناک، خاک آلود ہو اُس کی ناک جس نے اپنے والدین کو یا دونوں میں سے کسی کو بڑھاپے میں پایا اور پھر وہ جنت میں داخل نہ ہوا"۔ ایک شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے جہاد میں شرکت کی اجازت مانگی۔ آپ نے فرمایا: کیا تمہارے والدین موجود ہیں؟ اُس نے کہا: جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: ففیھما فجاھد (انہی کی خدمت میں رہ کر جہاد کرو)۔ ایک اور آدمی نے آپ سے عرض کیا: کیا والدین کی موت کے بعد بھی کوئی نیکی ہے جو میں اُن کے حق میں کر سکتا ہوں؟ آپ نے فرمایا: "ہاں، اُن کے حق میں دعا کرنا، اُن کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کرنا، اور اُن کے بعد اُن سے کیے ہوئے عہد کو نافذ کرنا، اور اُن کے ذریعے جو صلہ رحمی کی جاتی تھی وہ صلہ رحمی کرنا، اور اُن کے دوستوں کی عزت افزائی کرنا"۔

موجودہ دور میں بیٹے اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور وسعتِ ظرف سے پیش نہیں آتے ہیں تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ والدین اپنی اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت نہیں کرتے۔ چنانچہ اُن کے درمیان روحانی اقدار کے بجائے مادی اقدار کا غلبہ ہو جاتا ہے۔ اور بیٹے کے لیے دولت دنیا اس قدر عزیز ہو جاتی ہے کہ وہ لیسا اوقات والدین کے حقوق پامال کر جاتا ہے۔ مگر اس سلسلے میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم بالکل مختلف ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ ایک مرتبہ ایک شخص آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اپنے والد کے بارے میں آکر یہ جھگڑا کرنے لگا کہ میرے والد کے ذمے میرا قرض ہے مگر وہ اُس کو ادا نہیں کر رہا ہے۔ آپ نے اُسے نصیحت فرمائی کہ اَنْتَ وَمَالُکَ لِاَبِیْکَ (تُو اور تیرا مال دونوں تیرے باپ کی مِلک ہیں)۔ اس نصیحت میں آپ نے اس آدمی کو فوراً اُس کا یہ مقام یاد دلا دیا کہ تُو جس انسان کے بارے میں قرض نہ دینے کی شکایت کر رہا ہے وہ عام انسان نہیں ہے۔ وہ تیرا باپ ہے۔ اُس نے تمہیں پال پوسا اور تمہیں اس قابل بنایا کہ زندگی کے کارزار میں اپنے لیے راستے ہموار کرو ... اس لیے تمہارا مال جس کی ملکیت کا تم دعویٰ کر رہے ہو بالواسطہ تمہارے باپ کی ملکیت ہے۔ تم اپنے باپ کا ایک جزو ہو اور بالتبع تمہاری ہر چیز تمہارے باپ کی زیرِ تصرف ہے۔

ایک اور روایت کے اندر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید واضح فرما دیا کہ اولاد کو اپنے والدین کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ابوداؤد اور ابن ماجہ میں مروی ہے کہ ایک آدمی آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آکر کہنے لگا: میرے پاس کچھ مال ہے اور میرا باپ میرے مال کا بڑا حاجت مند ہے۔ میں کیا کروں۔ آپؐ نے فرمایا: انت ومالك لوالدك (تُو اور تیرا مال دونوں والد کے لیے ہو)۔ آپؐ نے اُسے یہ تلقین کرنے کے بعد والدین کو اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ: ان اولادكم من اطيب كسبكم۔ كلوا من كسب اولادكم۔ (تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی ہے۔ تم اپنی اولاد کی کمائی میں سے کھاؤ)۔

یہ تو عام معاملات اور لین دین کی بات تھی۔ لیکن جس طرح باپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اولاد کی صحیح تربیت کرے۔ اُسے دین کا رسیا اور اخلاق کا کھرا انسان بنائے۔ اسی طرح بالغ اور باشعور اولاد پر بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اگر اس کے والدین دین میں کمزور ہوں تو وہ انہیں دین کا پابند ہونے کی نصیحت کرے۔ اور خوش اسلوبی اور نرم گفتاری سے انہیں دین کی طرف راغب کرے، اور دین کا کام کرنے والوں سے انہیں تعاون کا مشورہ دے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے چچا ابوطالب کو آخر وقت تک ایمان کی دعوت دیتے رہے۔ چنانچہ وہ گھرانہ بڑا خوش قسمت اور گہوارہ سعادت ہوتا ہے جہاں والدین بھی دین کے پابند ہوں اور اولاد بھی ان کے نقشِ قدم پر چل رہی ہو۔ لیکن اگر دونوں میں اختلاف ہو تو گھریلو زندگی سکون سے ناآشنا ہو جاتی ہے۔ اگر والدین دین کی اتباع نہ کریں تو پھر اولاد کا طریقہ یہ ہونا چاہیے کہ دُنیا کے معاملات میں اولاد معروف طریقے سے والدین کا ساتھ دیتی رہے۔ مگر اُن کی کسی ایسی بات کو قبول کرنے سے صاف معذرت کر دے جو خدا و رسولؐ کے احکام کے خلاف اور دین کے بنیادی تقاضوں کے منافی ہو۔

حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے خلاف الزامات
(عائد کردہ شہنشاہ جہانگیر)

جناب ابصار عالم (سندھ یونیورسٹی جام پور)

برصغیر اور پاکستان میں تحریکات اسلامی کی تاریخ کو سمجھنا اس کے بغیر ممکن ہی نہیں کہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی کے کیے ہوئے کام اور ان کو پیش آنے والی کشمکش کو سمجھا جائے۔ وہی جہانگیر جو بادشاہی سیاست کے تقاضوں اور مصاحبوں کی دخل اندازیوں سے ایک وقت میں حضرت مجدد سے عناد رکھتا ہے اور ان پر الزامات لگاتا اور انہیں حوالۂ زنداں کرتا ہے، بعد میں جب وہ غلط فہمیوں کے غبار سے نکل آتا ہے تو آنجناب سے استفادہ کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ دورِ اکبری کے پیدا کردہ احوال میں اصلاح کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اورنگ زیب عالمگیر نمودار ہوتا ہے اور وہ خلافِ اسلام تصورات، معمولات اور قوانین و شعائر کا قلع قمع کر کے اسلامی نظام کے عملی نفاذ کی بھرپور کوشش کرتا ہے۔

حضرت مجدد کے کام کا مطالعہ کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ آپ نے سیاسی دائرے میں احیائے اسلام کا ایک بالکل الگ طریقہ اختیار کیا۔ یعنی اہل قوت و اختیار درباریوں اور حاکموں میں سے اچھے لوگوں تک بذریعہ خط و کتابت دعوتِ حق پہنچائی اور اقامتِ دین کے فریضہ میں حصہ لینے کے لیے ان کو ابھارا۔ رفض و بدعات اور ہندوانہ تہذیب کے غلبے کو ختم کرنے اور طریق نبوت پر کاربند ہونے کی دعوت دی۔ خدا کی تائید سے یہ کوشش کامیاب ہوئی۔

اس کوشش میں سبق یہ ہے کہ کبھی اقتدار کی اصلاح کے لیے دوسرے راستوں سے

سامنے سے آکر موثر کام کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ایسی صورت میں اہل قوت و اختیار میں سے نسبتاً اچھے افراد کو رشد و ہدایت کی روشنی سے بہرہ مند کرنے کی راہیں نکالنی پڑتی ہیں۔ اس خاص طریق تحریک (METHADOLOGY OF MOVEMENT) کا بہترین نمونہ حضرت مجدد اور آپ کے مریدوں کے کام میں ملتا ہے۔

اس اہمیت کے پیش نظر جناب الصار عالم صاحب کا یہ مضمون ان اوراق میں پیش کیا جا رہا ہے۔

شہنشاہ جہانگیر اپنی خود نوشت تزک میں سن جلوس ۱۴ ماہ خورداد ۲۲ کو تحریر کرتا ہے "کہ انہی دنوں مجھ سے عرض کیا گیا کہ شیخ احمد نامی ایک جعل سازؔ نے سرہند میں مکر و فریب کا جال بچھا کر بھولے بھالے لوگوں کو پھانس رکھا ہے۔ یہ خلیفے لوگوں کو فریب دینے اور معرفت کی دکانداری کرنے میں بہت پختہ ہیں۔ اس نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کے نام وقتاً فوقتاً جو واہیات خطوط لکھے ہیں انہیں مکتوبات کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا ہے۔ اس دفتر بے معنی میں اس نے بہت سی ایسی بیہودہ باتیں تحریر کی ہیں جو کفر کی حد تک پہنچتی ہیں۔ ایک مکتوب میں اس نے لکھا ہے کہ مقامات سلوک طے کرتے ہوئے وہ مقام ذی النورین میں پہنچا جو نہایت عالی شان اور پاکیزہ تھا۔ وہاں سے گزر کر مقام فاروق اور مقام فاروق سے گزر کر مقام صدیق میں پہنچا۔ پھر وہاں سے گذر کر مقام محبوبیت میں پہنچا جو نہایت منور و دلکش تھا۔ اس مقام میں اس پر مختلف روشنیوں اور رنگوں کے پرتو پڑتے رہے۔ گویا استغفر اللہ بزعم خویش وہ خلفاء کے مرتبے سے بھی بڑھ گیا اور ان سے عالی تر مقام پر فائز ہوا۔ اس نے

---

۱ یقیناً حضرت مجددؒ کے متعلق ایسے الفاظ نقل کرتے ہوئے اذیت ہوتی ہے، مگر تاریخی تحقیق میں مخالفانہ باتیں سامنے لانی پڑتی ہیں (ن ص)

۲ مشاہدہ مقامات یا سیر مقامات کے صوفیانہ تصورات کا مجھے براہ راست شعور حاصل نہیں، مگر مشاہدہ و سیر بصورت کشف کے یہ معنی نکالنا کہ کسی شخص نے وہ مقام پالیا یا وہ اس کا مدعی ہے، غیر معقول بات ہے لیکن اہل اقتدار کو برانگیختہ کرنے والے مصاحبین اسی طرح مغالطہ انگیزی سے کام لیتے ہیں (ن ص)

اس طرح کی اور بھی بہت سی گستاخانہ باتیں (خلفاء کی شان میں) لکھی ہیں جن کو تحریر کرنا طوالت اور خلفاء کی شان میں بے ادبی کا باعث ہوگا۔ مذکورہ وجوہات کی بنا پر میں نے اُسے دربار میں طلب کیا تھا۔ حسب الطلب حاضر خدمت ہوا تو میں نے اُس سے جتنے سوالات بھی کیے اُن میں سے کسی ایک کا بھی کوئی معقول جواب نہیں دے سکا۔ "بے عقل و کم فہم" ہونے کے علاوہ "مغرور" و "خود پسند" بھی نکلا۔ چنانچہ میں نے اس کے حالات کی اصلاح کے لیے یہی موزوں سمجھا کہ اسے کچھ دنوں کے لیے قید رکھا جائے تاکہ اس کے مزاج کی شوریدگی اور اس کے دماغ کی آشفتگی جاتی رہے اور عوام میں جو شورش پھیلی ہوئی ہے وہ ختم جائے۔ چنانچہ اسے انی رائے سنگھ دلان کے حوالہ کیا کہ اسے قلعہ گوالیار میں قید رکھے[۱]۔

شہنشاہ جہانگیر (۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء) کی یہ اپنی تحریر بہت واضح ہے جس میں کسی ابہام کی گنجائش نہیں۔ پہلی بات تو یہ کہی گئی کہ "شیخ احمد نامی ایک جعل ساز نے سرہند میں مکر و فریب کا جال بچھا کر بھولے بھالے لوگوں کو پھانس رکھا ہے۔ یہ خلیفے لوگوں کو فریب دینے اور معرفت کی دکان داری کرنے میں بہت پختہ ہیں۔"

جہانگیر شیخ احمد سرہندیؒ کا تذکرہ اس سے قبل اپنی تزک میں کہیں نہیں کرتا۔ پہلی ہی بار جب آپ کا ذکر کرتا ہے تو "جعل ساز" کہتا ہے اور مکر و فریب کا جال بچھانے کا الزام عائد کرتا ہے جس میں بھولے بھالے پھنس گئے ہیں اور یہ کہ یہ خلیفے لوگ فریب دینے اور معرفت کی دکان داری کرنے میں بہت پختہ ہیں۔

اِن الزامات میں پہلے الزام یعنی سرہند میں مکر و فریب کا جال بچھا کر لوگوں کو پھانسنے کی حقیقت یہ ہے کہ تزک جہانگیری۔ اقبال نامہ جہانگیری عمل صالح اور منتخب اللباب کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ سرہند اس دَور کا ایک اہم شہر تھا۔ اسے انتظامی، سیاسی و تجارتی مرکزیت حاصل تھی۔ یہاں جہانگیر اور شاہ جہاں نے متعدد بار قیام کیا اور یہاں سے گزرے اور جہانگیر تو سن جلوس ۱۴ ہی میں جمعرات ۱۲ دی ماہ کو یعنی شیخ احمد سرہندی کو قلعہ گوالیار میں قید کا حکم دینے کے چھ ماہ بعد

۱۔ تزک جہانگیری (اردو) سلیم واحد سلیم۔ مجلس ترقی ادب کلب روڈ لاہور) ص ۵۶۳-۵۶۴

سرہند ہی قیام کرتا ہے۔ اور سرہند میں باغات لگوانے اور عمارات سازی کے لیے خاص احکام بھی دیتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرہند کو اُس دَور میں ایک اہم مقام حاصل تھا۔[۱]

دوسرا الزام یعنی ہر شہر و قریہ میں خلیفے مقرر کرنا جو لوگوں کو فریب دینے اور معرفت کی دکان داری چلانے میں پختہ ہیں اُس کی حقیقت یہ ہے کہ آپ کی تحریک اتباعِ سنت نبوی جس کی ابتداء آپ نے ۱۶۰۳ء میں کی تھی وہ ۱۶۱۹ء یعنی جس سال آپ کو دربار میں طلب کیا تھا اور قلعہ گوالیار میں قید کیا گیا، اُس وقت تک بہت ہی وسیع، ہمہ گیر اور مقبول ہو چکی تھی اور اس کے اثرات مُلک کے دور دراز گوشوں تک پھیل گئے تھے۔ اور آپ کے معتقدین و متاثرین منظم طور پر احیائے اسلام کے لیے کام کر رہے تھے۔ آپ کے مُریدین ذہین، باصلاحیت، اہلِ علم، معاملہ فہم اور سوجھ بوجھ رکھنے والے افراد تھے۔ جن کی نگاہیں دُور رس اور فکر صائب تھیں، اس لیے اُن کی باتوں میں اثر تھا۔ لوگ اُن کے علم و عمل سے متاثر ہوتے تھے۔ پھر یہ لوگ محض قول ہی کے دھنی نہ تھے بلکہ جو کچھ کہتے تھے اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ اُن کی زندگیاں کسی مفاد، تضاد اور خود غرضی پہ مبنی نہ تھیں۔ یہ اخلاص و عمل کے پیکر تھے اس لیے لوگ نہ صرف ان کی باتیں سُنتے تھے بلکہ عمل بھی کرتے تھے اور ان کی آواز پر لبیک بھی کہتے تھے۔

شیخ احمد سرہندی (حضرت مجدد الف ثانیؒ) سرہند ہی میں ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوئے۔ اس زمانے میں شہنشاہ اکبر ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک ہندوستان پہ حکمران تھا۔ اسی کے آخری عہد ۱۵۹۹ء میں حضرت خواجہ باقی باللہؒ کے مرید ہوتے ہیں اور اپنے پیر و مرشد کے ۱۶۰۳ء میں انتقال کے بعد جہانگیر کی تخت نشینی سے دو سال قبل رشد و ہدایت یعنی تحریک احیاء اسلام کا باقاعدہ آغاز کرتے ہیں۔ آپ کے متعلق حضرت خواجہ باقی باللہؒ نے یہ کہا تھا کہ شیخ احمد "کثیر العلم و قوی الارادہ" ہے۔ چنانچہ حضرت خواجہ باقی باللہ کے جانشین ہوتے ہی آپ نے اتباع سنّت نبوی، ترویج شریعت اور نفاذِ شریعت کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں ابتداء ہی میں ایک رسالہ بعنوان "اثبات النبوۃ" لکھا جس میں دلائل کے ذریعے نبوت کی غایت، اہمیت، افادیت اور ہمہ گیریت کو ثابت کیا۔ اور اکبر

---

[۱] تزک جہانگیری اُردو ص ۵۰۵۔

کے نصف صدی کے دورِ حکومت میں "عقل، فلسفہ، مصلحت ملکی 'تجربہ' جو بطور معیار کے اختیار کر لیا گیا تھا اس کی خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کی۔ دوسرے الحاد و بے دینی کی سرپرستی و فروغ سے ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جو اکابر صحابہ کرام کے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار تھا۔ آپؒ نے فکر کی کجی کو دُور کرتے اور ذہن و فکر کی مثبت اصلاح کے لیے رسالہ "ردِّ روافض" تحریر کیا جس میں خلفاء راشدین کی پاکیزگی اور عظمت کو قرآن و سنتِ رسول، احادیث اور عقل کی روشنی میں پیش کیا۔ خلفاء راشدین اور دیگر صحابہ کرام کے بارے میں جو گمراہ کن باتیں مشہور عام ہیں ایسی غلط باتوں کی تردید کی۔ اس کے علاوہ جہانگیر کے عہد کے متعدد امراء مملکت کو جو اعلیٰ مناصب پر فائز تھے انہیں مکتوبات لکھے تھے جن کی معرفت نہ صرف اُن کے ذہن و فکر کی تطہیر کر رہے تھے بلکہ غلط تصورات، عقائد اور باطل نظریات سے آگاہ کر کے انہیں ترویج شریعت اور نفاذ شریعت کے لیے ترغیب دے رہے تھے۔ چنانچہ شہنشاہ جہانگیر کی تخت نشینی اور حکومت کے حصول میں شیخ فرید بخاری کو سب سے زیادہ اہمیت اور اوّلیت حاصل ہے۔ شیخ فرید بخاری حضرت خواجہ باقی باللہ کے مرید اور اس حیثیت سے شیخ احمد سرہندی (حضرت مجدد الف ثانیؒ) کے پیر بھائی اور اکبر کے آخری دورِ حکومت میں مملکت کے اہم عہدیدار تھے۔ شیخ احمد سرہندیؒ (حضرت مجدّد الف ثانیؒ) نے اس زمانے میں جب اکبر کا آخری دورِ حکومت تھا اور اس کے بعد جانشینی کا مسئلہ درپیش تھا اور حکومت کے دعویدار بھی موجود اور کوشاں تھے تو آپ نے شیخ فرید بخاری کے نام یکے بعد دیگرے ۱۲ خطوط مسلسل لکھے ہیں جو مکتوبات امام ربّانی کی جلد اوّل میں ۴۳ تا ۵۴ مسلسل ہیں اور شیخ فرید بخاری جہانگیر کو تخت نشین کرانے میں اہم ترین رول ادا کرتے ہیں۔ جہانگیر ان کی اس خدمت کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں انعامات و اکرامات کے علاوہ "صاحب السیف والقلم" کا خطاب دیتا ہے۔[۱] جہانگیر کے مقابلے میں خسرو (پسر جہانگیر اور اکبر کا پوتا) جب دوبارہ سر اُٹھاتا ہے تو شیخ فرید بخاری ہی تندی و تیزی سے خسرو کا تعاقب کرتے ہیں اور دوبارہ شکست دے کر اس کو ناکام کرتے ہیں اور جب جہانگیر کو اس کامیابی سے مطلع کرتے ہیں تو جہانگیر بہت خوش ہوتا ہے اور قاصد کو "خوش خبر" کا خطاب دیتا ہے اور انہیں "مرتضیٰ خاں" کا خطاب اور دیگر دوال کا علاقہ

---

[۱] تزکِ جہانگیری ص ۲۵۔

بطور جاگیر دیا ہے[1]۔ شیخ فرید کے علاوہ جہانگیر کے عہد کے متعدد امراء مملکت مثلاً عبدالرحیم خانخاناں مرزا اعسام الدین، خان جہاں، جباری خاں، مرزا فتح اللہ، حکیم مرزا دواب، قلیج خاں، بہادر خاں صدر جہاں، خواجہ جہاں، لالہ بیگ، خان اعظم وغیرہ امراء مملکت کو بھی خطوط لکھے ہیں جن کی تعداد کم و بیش ایک تنلو ہوتی ہے۔ یہ تمام خطوط جلد اوّل ہی میں موجود ہیں۔ ان تمام مکتوبات کا ایک ہی مرکزی موضوع مقاصد یہ کہ وہ اپنے عہدے و منصب سے فائدہ اٹھا کر شریعت کو نافذ کریں اس لیے جہانگیر کا یہ الزام کہ شیخ احمد ایک "جعل سازہے" جس نے مکر و فریب کا جال بچھا کر بھولے بھالے لوگوں کو پھانس رکھا ہے اور یہ خلیفے لوگ فریب دینے اور معرفت کی دکانداری کرنے میں بہت پختہ ہیں، سراسر ایک لغو الزام و اتہام ہے جس کی کوئی تاریخی حقیقت اور صداقت نہیں ہے اور خود جہانگیر نے بھی اپنے اس دعوے یا الزام میں کوئی واقعہ تحریر نہیں کیا ہے اور نہ ہی کوئی ثبوت پیش کیا ہے۔

دوسرے یہ لکھنا "کہ اس نے اپنے مریدوں اور معتقدوں کے نام وقتاً فوقتاً جو واہیات خطوط لکھے ہیں انہیں مکتوبات کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں جمع کیا ہے۔ اس دفتر بے معنی میں اس نے بہت سی ایسی بیہودہ باتیں تحریر کی ہیں جو کفر کی حد تک پہنچتی ہیں" جہانگیر کا یہ اشارہ شیخ احمد سرہندی کے مکتوبات کے اس مجموعے کی طرف ہے جو ۱۶۱۶ء بمطابق ۱۰۲۵ھ دربار میں طلبی اور قلعہ گوالیار میں قید سے تین سال قبل ایک کتابی شکل میں شائع ہوا تھا۔ اس مجموعہ میں ۳۱۳ مکتوبات ہیں اور یہ تعداد اصحاب بدر کی رعایت پر ہے۔ اصحاب بدر کو تاریخِ اسلام میں ایک بہت ہی بنیادی و مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ یہی اصحاب ہیں جو ۲ھ میں بمطابق ۶۲۳ء، رمضان المبارک میں قلیل تعداد، ساز و سامان اور اسلحہ کی کمی کے باوجود، لشکر کفار جو تعداد، ساز و سامان اور اسلحہ کی فراوانی میں فوقیت رکھتا تھا اس پر نہ صرف کاری ضرب لگائی بلکہ انہیں شکست فاش دے کر مسلمانوں کے حوصلے اور عزم کو بلند کر دیا اور اہل کفر کے نخوت و پندار کو پاش پاش کر دیا۔ یہ اہل اسلام اور اہل کفر کے درمیان پہلی مسلح جنگ تھی جس میں اہل اسلام کو اللہ کی تائید و نصرت سے کامرانی حاصل ہوئی اور اہل کفر کو شکست و ہزیمت سے دوچار ہونا پڑا۔ اس کتاب کا تاریخی نام " درالمعرفت " ہے۔ یہ تمام مکتوبات بلاشک

[1] تزک جہانگیری ص ۹۵

مریدین و معتقدین ہی کو لکھے گئے ہیں جن کا مرکزی موضوع توحید، رسالت، کفر و شرک، شریعت کی اہمیت و عظمت، ترویج شریعت اور اتباعِ سنتِ نبوی کی ضرورت ہے، جو آج بھی دیکھے و پڑھے جا سکتے ہیں جو بظاہر ایک فرد کے نام تحریر کیے گئے ہیں جو جدید اصطلاح میں رسالہ یا پمفلٹ سے تعبیر کیے جا سکتے ہیں۔ یہ مکتوبات جن موضوعات یا مسائل پر لکھے گئے ہیں ان کا تعلق ہر دور میں ہر مسلمان سے ہے۔ یہ خطوط چونکہ عام افادیت اور عمومی دلچسپی کے تھے اور کسی وقتی یا ہنگامی مسائل سے متعلق نہ تھے بلکہ ان کی مستقل اہمیت تھی جن میں اسلام کے بنیادی مسائل توحید، رسالت، آخرت اور اسلامی تعلیمات کی توضیح و تشریح اور اسلامی تاریخ کے بعض واقعات کی تعبیر و تشریح اور مختلف معاملات کے متعلق اسلام کی حدود وغیرہ پر بحث تھی۔ آپ کے حلقہ ارادت و اثر میں روز بروز اضافہ ہونے کی وجہ سے ان کی مانگ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اس لیے عمومی مفاد کے پیش نظر شائع کرائے تاکہ یہ خطوط یکجا مل سکیں اور لوگ ان سے استفادہ کر سکیں۔ جہاں تک ان خطوط کے مجموعہ کو " دفتر بے معنی" کہنے کا تعلق ہے تو ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے؟ ایسے اہم مسائل اور مباحث پر مشتمل مجموعہ کو دفترِ بے معنی وہی شخص کہہ سکتا ہے جو بصارت و بصیرت سے عاری ہو یا غیظ و غضب نے اس کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے ہوں اور عقل و فہم کے دروازے بند کر دیے ہوں۔

یہ خطوط آج بھی ملتے ہیں اور قبولیت عام کا یہ عالم ہے کہ متعدد بار فارسی اور اُردو میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے مطالعہ سے حقیقت شناس اور تاریخ کا غیر جانبدار طالب علم بہ آسانی سمجھ سکتا ہے کہ جہانگیر کے الزام و اتہام کی کیا نوعیت اور حقیقت ہے؟ اور اس میں کہاں تک صداقت ہے؟ اور یہ خطوط بقول جہانگیر کے "واہیات" اور " دفتر بے معنی" ہیں؟ یا واقعی " درالمعرفت" یعنی معرفت کے موتی ہیں؟

(باقی آئندہ)

اسلام کا انسانِ مطلوب

از جناب سیّد اسعد گیلانی صاحب

[یہ تقریر ریڈیو کویت کی اُردو سروس میں ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء کو نشر کی گئی]

اسلام کا انسانِ مطلوب مسلمان ہے اور اس کا بے خطا کامل ترین اور بے مثال نمونہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ اس انسان کا پورا خاکہ قرآن میں دے دیا گیا ہے۔ گویا قرآنِ مجید اس مطلوبہ انسان کا مستند مرقع ہے۔ اسی لیے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے جب لوگوں نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے فرمایا:

"کیا تم نے قرآن کا مطالعہ نہیں کیا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا خُلق قرآن ہی تھا۔"

گویا قرآن کے مثالی اور کامل نمونۂ انسان کی معیاری صورت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک ہے۔ اسی لیے تمام مومنین کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پر چلیں اور آپؐ کے اسوۂ مبارک کی پیروی کریں۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ "تمہارے لیے رسولؐ اللہ کی ذات میں بہترین نمونہ موجود ہے۔"

اس طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں عملی طور پر انسانِ مطلوب کا یہ مثالی اور کامل نمونہ پیش کرنے کے بعد قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پسندیدہ انسان کے خدوخال اور اوصاف کو بھی جابجا بیان کیا ہے۔ اگر ہم "اسلام کا مطلوبہ انسان" کا عنوان دے کر قرآن کا مطالعہ کرتے چلے جائیں اور قرآن میں جابجا مومن کی دی گئی صفات کو اس عنوان کے تحت لکھتے چلے جائیں تو بالآخر سیرت، اعمال، کردار، افکار اور اوصاف کا ایک ایسا خاکہ تیار ہو جاتا ہے جسے ہم اسلام کے 'انسانِ مطلوب' کا خاکہ کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر ان صفات کو اپنے کردار اور اعمال میں جذب کرنے کی کوشش کریں تو ہم اسلام کے انسانِ مطلوب کے نقشے میں

حسبِ حیثیت اور بقدرِ صلاحیت رنگ بھر سکتے ہیں۔ یہ رنگ جو قرآن کے بتائے ہوئے نقشہ کے مطابق کسی کردار میں بھرا جاسکتا ہے، صبغۃ اللہ کہلاتا ہے اور جس قدر صبغۃ اللہ گہرا ہوتا جاتا ہے اسلام کے انسانِ مطلوب کے نقش و نگار نکھرتے چلے جاتے ہیں۔

اسلام کا انسانِ مطلوب کسی غار میں نہیں پایا جاتا بلکہ دنیا کی بھرپور مصروفیات میں رہ کر وہ کارِ دنیا کو خدا کی ہدایت کے مطابق سرانجام دیتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ دنیا سے فرار ہوکر کسی خانقاہ میں بھی پناہ گزین نہیں ہوتا۔ بلکہ دنیا کو خدا کی بندگی میں لانے کی سعی کرتا ہے۔ وہ مارکس کا معاشی حیوان نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک معتدل، معقول، خدا ترس، سنجیدہ اور متوکل انسان ہوتا ہے جسے خدا کی ذات اور پھر اپنی ذات پہ اعتماد ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو پورے شعور کے ساتھ جانتا ہے اور اسی شعور کی مدد سے وہ اپنے مالک اور خالق کو بھی پہچانتا ہے۔ وہ حضرت علیؓ کے قول مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ کے مصداق اپنی ذات کے عرفان کی روشنی میں اپنے مالک کو پہچانتا اور اس کے حقوق ادا کرتا ہے۔ وہ خدا کا ایک ایسا سیدھا سادھا شریف اور بااصول بندہ ہوتا ہے جو نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے، نہ کسی سے دھوکا کھاتا ہے اور نہ کسی سے خوف اور طمع کا تعلق رکھتا ہے۔ وہ بقولِ حضرت عیسیٰؑ کبوتر سے زیادہ معصوم اور سانپ سے زیادہ ہوشیار اور چوکنا ہوتا ہے۔ اسی لیے حضورِ اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ:

"مومن کی بصیرت سے ڈرو وہ خدا کے نور سے دیکھتا ہے"۔

اور یہ کہ:

"مومن ایک بل سے دو بار ڈسا نہیں جاتا"۔

اسلام کا انسانِ مطلوب، مسلمان ایک خاص وضع کا انسان ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت آدمؑ کی اولاد بنی نوع انسان ہے اور اس پوری نوع کے مختلف گروہوں میں سے مسلمانوں کو چھانٹ چھانٹ کر علیحدہ کرکے ایک گروہ بنایا گیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۔ یعنی مسلمان ایک بہترین اُمت ہیں جسے لوگوں کی خاطر کھڑا کیا گیا ہے۔ اس کا کام نیکی کا حکم، بدی کی ممانعت اور خدا کا کلمہ بلند کرنا ہے۔

اسلام کے انسانِ مطلوب میں تین بنیادی شرائط کا پایا جانا لازم ہے:

•۔ وہ سخت قسم کا موحدِ انسان ہوتا ہے۔ وہ خدا کی ذات کے ساتھ کبھی کسی کو شریک نہیں بناتا اور اپنی تمام توقعات اور عبادات صرف اسی سے وابستہ رکھتا ہے۔

•۔ وہ سب انبیاء کو مانتا ہے اور حضورؐ اکرم کی ہدایات کا پابند اور علمبردار ہوتا ہے۔

•۔ وہ خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے دنیا کے تمام اعمال و افکار کے لیے جواب دہی کا شدید اور واضح شعور رکھتا ہے۔

یہ تینوں صفات اس میں بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس کے بغیر اسلام کے انسانِ مطلوب کا ہیولیٰ تیار نہیں ہوتا۔

اس کے بعد پھر وہ اضافی صفات ہیں جن کی مدد سے وہ بہتر سے بہتر اور اعلیٰ سے اعلیٰ مدارج حاصل کرتا چلا جاتا ہے جس کے سبب وہ معیاری اور مثالی نمونے کے قریب تر ہوتا جاتا ہے۔ قرآن نے مختلف سورتوں میں مختلف مقامات پر مفصل ارشادات ان صفات کو بیان کرنے کے لیے وقف کیے ہیں۔ جو سورۂ بنی اسرائیل، سورۂ الفرقان، سورۂ لقمان، سورۂ انعام، سورۂ توبہ، سورۂ بقرہ اور سورۂ مومنون میں ہم کو ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ احادیثِ رسولؐ اللہ میں بھی اس کی پوری تصویر کشی کی گئی ہے۔ مثلاً سورۂ الفرقان میں اسلام کے انسانِ مطلوب کی تصویر یوں پیش کی گئی ہے:

•۔ وہ زمین پر نرم روی کی چال اختیار کرتے ہیں جو کبر و غرور اور جبر و تشدد کے منافی ہے۔

•۔ وہ جہلا سے واسطہ پڑ جائے تو سلام کہہ کر پہلو تہی کر لیتے ہیں۔

•۔ وہ راتوں کو جاگ جاگ کر اللہ کی عبادت اور بندگی بجالاتے ہیں۔

•۔ وہ خرچ میں نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ بخل بلکہ میانہ روی اختیار کرتے ہیں۔

•۔ وہ خدا کے ساتھ کسی کو پکار کر اسے خدا کا شریک نہیں بناتے۔

•۔ وہ ناحق کسی کی جان ہلاک نہیں کرتے۔

•۔ وہ زنا سے اجتناب کرتے ہیں۔

•۔ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔

•۔ وہ فضولیات اور لغویات کے ہجوم میں باوقار طریقے سے گزر جاتے ہیں۔

سورۂ مومنون میں اس انسان کی تصویر یوں دی گئی ہے:

- ان کی نمازوں میں خشیتِ الٰہی کا رنگ غالب ہوتا ہے۔
- وہ اپنی آبرو اور عصمت کی حفاظت کرتے ہیں
- وہ امانتوں اور وعدوں کے امین اور محافظ ہوتے ہیں۔

پھر سورۂ لقمان میں ان کی جھلک یوں دکھائی گئی ہے:

- وہ زمین میں تکبر اور سرکشی سے نہیں چلتے۔
- وہ معاملات میں اعتدال اختیار کرتے ہیں۔
- وہ اپنی آواز کو غیر سنجیدہ طریقے پر بلند نہیں کرتے بلکہ دھیمی رکھتے ہیں۔

سورۂ توبہ میں ان کے بارے میں فرمایا گیا:

- وہ اپنے گناہوں پر توبہ کرنے والے ہوتے ہیں۔
- وہ خدا کی حمد کے خوگر ہوتے ہیں۔
- وہ اللہ کی راہ میں گھر سے نکلتے ہیں۔
- وہ رکوع و سجود کرتے ہیں۔
- وہ بدیوں کی روک تھام کرتے ہیں۔
- وہ اللہ کی مقرر کردہ حدود کے سختی سے پابند ہوتے ہیں۔

یہ وہ چند قرآنی خدوخال ہیں جو اسلام کے انسانِ مطلوب میں کسی نہ کسی درجے میں ہونے ضروری ہیں۔ چنانچہ انہی کی روشنی میں اسلام کے معلمینِ اخلاق نے پھر مزید صفات اور بھی بیان کیے ہیں۔ مثلاً:

- وہ صحبتِ صالح اختیار کرتے اور بھلے لوگوں کے ساتھ رفاقت رکھتے ہیں۔
- وہ نیک لوگوں کے اچھے اعمال کو اپنے لیے مثال بناتے اور ان پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔
- وہ اللہ کے کلمے کو بلند کرنے کی جدوجہد کرتے ہیں۔
- وہ علمِ حق کے طالب، حق کے جویا اور پرستار، نیتِ خیر کے حامل اور بیدار ضمیر ہوتے ہیں۔
- وہ بلند اخلاق، فراخ حوصلہ، فیاض، نرم خو، حساس اور دین کی تڑپ رکھنے والے ہوتے ہیں۔
- وہ باہمی محبت کرنے والے، خدا ترس، کھرے، حق گو، نفاق سے پاک، صابر و شاکر، وفاشعار

اور ہر وقت توبہ و استغفار کرنے والے ہوتے ہیں۔

ان خوبیوں کے ساتھ جن برائیوں سے وہ سختی کے ساتھ بچتے ہیں ان کا بھی جا بجا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ فحش، جھوٹ، غیبت، بدگوئی، بدگمانی، وعدہ خلافی، الزام تراشی، خوشامد، بخل، غیظ و غضب، بغض، کینہ، فضول خرچی اور حسد سے اس طرح بچتے ہیں جس طرح سارے انسان سانپوں سے بچتے ہیں۔

غرض اسلام کا انسان مطلوب کوئی ڈھکا چھپا انسان نہیں ہوتا وہ معاشرے میں اپنے اطوار و اعمال سے جانا پہچانا انسان ہوتا ہے۔

- وہ دین سے مخلصانہ محبت کا حامل ہوتا ہے اور اس کے لیے ہر قربانی دے سکتا ہے۔
- وہ دین کی معرفت یعنی علمِ دین حاصل کرتا اور خدا و رسولؐ کے احکام سے آگاہ ہوتا ہے۔
- وہ دین کی حفاظت کرتا اور اس کو اپنے اعمال میں محفوظ کرتا ہے۔
- وہ دین کے راستے میں ہر مشکل کے وقت استقامت کا راستہ اختیار کرتا ہے۔
- اور وہ دینی خدمات میں مسابقت کر کے دوسروں سے زیادہ سے زیادہ آگے بڑھنے کی سعی کرتا ہے۔ یہ ہیں وہ چند صفاتِ مطلوب، جو اگر کوئی انسان اپنے اندر پیدا کرے تو وہ حقیقی طور پر اسلام کا انسانِ مطلوب بن جاتا ہے۔

رسائل و مسائل

اسلامی حدود و تعزیرات سے متعلق چند ضروری توضیحات

ملک غلام علی صاحب

سوال:- جنوری کا شمارہ ترجمان پڑھا، جناب قاضی بشیر احمد صاحب کا مضمون "ثبوتِ سرقہ کے ذرائع" نظر سے گزرا۔ اس مضمون پر دو ایک باتیں تفصیل طلب ہیں۔ دل کی تسلی نہیں ہوئی۔ اس لیے آپ کو زحمت دے رہا ہوں۔

۱۔ ترجمان کے صفحہ ۲۶ پر حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت ہے کہ آنحضورؐ نے لونڈی سے فرمایا کہ "کہہ دے کہ نہیں"۔ یعنی لونڈی کو چوری کے جرم سے انکار کی تلقین فرمائی۔

۲۔ ترجمان کے صفحہ ۲۷ پر حضرت ماعز رضی اللہ عنہ کی سزا کے بارے میں حضورؐ نے فرمایا کہ "تم نے اسے جانے کیوں نہ دیا" یا "تم نے اُسے چھوڑ کیوں نہ دیا"۔

۳۔ صفحہ ۳۳ پر شہادت کی ایک ماہ کی میعاد کے بارے میں جو تشریح فرمائی گئی ہے۔ میرے خیال میں اس سے اور پردہ پوشی کے مشورے سے تو جرائم کو تقویت ملے گی اور شہادت میں تاخیر کئی وجوہ سے ہو سکتی ہے۔ یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا تھا۔ مدینہ منورہ کی اسلامی ریاست میں حضور اکرمؐ کی موجودگی کی وجہ سے جرائم نہ ہونے کے برابر تھے۔ میرا عقیدہ ہے کہ جو جرائم سامنے آئے وہ صرف اصلاحِ اُمت کی غرض سے تھے۔ اب ان احادیث یا روایات کو لیجیے۔ چور یا ملزم سے بیان لینے سے قبل ہی اگر کہہ دیا جائے کہ کہہ دے تم نے جرم نہیں کیا۔ یا تو اس سے ملزم

کے ارتکاب جرم کو تقویت ملے گی۔ یا اگر سزا دی جا رہی ہو اور مجرم بھاگ جائے تو انصاف کا تقاضا پورا نہیں ہوا۔ اسی طرح پردہ پوشی والا معاملہ ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ جب تک کوئی جرم سامنے نہ آئے تو اس کی پردہ پوشی ہو سکتی ہے اور وہ بھی اس حال میں کرنی چاہیے کہ اس سے معاشرے پر بُرا اثر نہ پڑتا ہو۔ یعنی خرابیاں تقویت نہ پکڑیں۔ ورنہ ایسے جرائم جن سے معاشرے میں بُرائیاں جنم لیتی ہیں ان کے بارے میں چشم پوشی مناسب معلوم نہیں ہوتی۔ ورنہ قتل، چوری، ڈاکہ، زنا اور دوسرے گھناؤنے جرائم کے مجرم مزید جرائم کرنے پر اصرار کریں گے۔

جواب: آپ کے سوالات کا جواب دینے سے پہلے یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے مختلف جرائم، بالخصوص فوجداری جرائم کے لیے جو سزائیں حدود و قصاص کی شکل میں مقرر کی ہیں ان سے مقصود معاشرے کی تنظیم و تطہیر بھی ہے اور اس کے ساتھ یہ امر بھی ملحوظ و مطلوب ہے کہ مجرمین کا تزکیۂ نفس ہو اور وہ عذاب اُخروی سے بچ سکیں۔ چنانچہ بعض احادیث میں بدنی سزا دینے کے بعد مجرم سے توبہ کرانے کا ذکر ملتا ہے تاکہ گناہ سے اُس کا ظاہر و باطن پوری طرح پاک و صاف ہو جائے اور وہ قیامت کی سزا سے محفوظ ہو جائے۔ اسی طرح جرائم کے معاملے میں اسلامی شریعت کا ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ جب تک جرم کا وقوع شک و شبہ سے بالاتر ہو کر ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک سزا کو نافذ نہ کیا جائے۔

اب جہاں تک اثباتِ جرم کا تعلق ہے اس کی سب سے زیادہ یقینی اور قطعی صورت تو یہ ہوتی ہے کہ مجرم خود بھی اعترافِ جرم کرے اور اس کے خلاف ارتکابِ جرم کی شہادت بھی موجود ہو۔ اس سے کم تر درجے میں اثباتِ جرم کی صورت یہ ہے کہ مجرم اقبالِ جرم نہ کرے مگر اس کے خلاف شہادت موجود ہو۔ مگر ایک نادر الوقوع، حیرت انگیز اور غیر معمولی صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ملزم کے خلاف شہادت موجود نہ ہو مگر وہ خود آگے بڑھ کر رضاکارانہ طور پر اقرارِ جرم کرے۔ اس طرح کا اقراری مجرم درحقیقت مجسّم توبہ و ندامت ہوتا ہے جو اپنی دنیوی راحت و وجاہت کو اُخروی نجات پر قربان کر دیتا ہے، حتیٰ کہ اپنی پیاری جان تک نثار کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے خطاکار جو پوری خوشدلی اور نفس کی آمادگی کے ساتھ دُنیا میں سزا پانے مگر اپنی آخرت کو بچانے کے لیے اپنے آپ کو پیش کرتے ہیں، یہ اگرچہ اپنی تطہیر کے لیے دُنیوی عقوبت کے چنداں

محتاج نہیں ہوتے لیکن اسلام کا فوجداری قانون عدل وانصاف کے عمومی اور ہمہ گیر تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے ان پر بھی حدود شرعیہ کا نفاذ بہر حال کرتا ہے جس میں ایک حکمت و مصلحت یہ بھی ہے کہ اگر شہادت کے بغیر اقرار جرم پر حدود و قصاص کو ساقط کر دیا جائے تو اس طرح کا اقرار جرم سزا سے بچنے کا ایک ذریعہ و بہانہ بن کر اپنی حقیقی قدر و قیمت کھو دے گا اور حقوق اللہ اور حقوق العباد پامال و معطل ہو کر رہ جائیں گے۔ تاہم شارع علیہ السلام نے اس نوع کے مجرمین کو عذر خواہی، اظہار برأت اور شک وشبہ سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش اور مہلت سب سے زیادہ دی ہے۔

اس پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اگر حضرت ماعزؓ سے متعلق روایت کردہ احادیث پر غور کیا جائے تو ان کا موقع و محل آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے اور سارے اشکال و سوالات کا جواب مل جاتا ہے۔ آپ نے جن احادیث کو نقل کیا ہے ان کا تعلق اس طرح کے مجرمین سے نہیں ہے جو ارتکاب جرم کے بعد اپنے جرم کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں، پولیس کسی نہ کسی طرح اُن کا سراغ لگا کر انھیں گرفتار کر لیتی ہے اور تفتیش کا ہر ذریعہ استعمال میں لا کر ان سے اعترافِ جرم کرا لیتی ہے، ان کے خلاف شہادت فراہم کر کے انھیں عدالت کے سامنے پیش کرتی ہے اور ملزمین کا وکیل انھیں پہلا سبق یہی پڑھاتا ہے کہ تم عدالت کے سامنے صاف انکار کر دو گے۔ اس طرح کے ملزمین کو اگر عدالت بھی یہ سمجھائے کہ تم تو مجرم نہیں معلوم ہوتے، تم کہہ دو کہ میں بالکل بے گناہ ہوں تو اس طرح بلاشبہ جرائم پیشہ افراد کی حوصلہ افزائی ہوگی اور جرم کو تقویت ملے گی۔ لیکن جو شخص خود سبقت کر کے اپنے آپ کو عدالت کے سپرد کر دیتا ہے اور اس کے خلاف کوئی شہادت بجز اس کے اپنے اقرار کے نہیں ہے۔ اس کا معاملہ دوسرے مجرمین سے بالکل مختلف ہے۔ یہ شخص جو اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر اقبال جرم کر رہا ہے، اس کے معاملے میں یہ مناسب بلکہ ضروری ہے کہ اس سے اقرار کی بار بار توثیق اور اس کے حالات کی مختلف انداز میں تحقیق کرائی جائے۔ اگر وہ اپنے اقرار سے رجوع کر لے یا عملاً ایسا رویہ اختیار کرے جو رجوع و انکار کے مترادف ہو، تو اس کے رجوع کو قبول کر کے حد کے نفاذ کو روکا جائے۔

حضرت ماعزؓ بن مالک اسلمی جن پر زنا کی حد رجم نافذ ہوئی تھی ان کا معاملہ بھی ایسا ہی تھا کہ انھوں نے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہو کر اقرار کیا تھا، ان کے خلاف مزید

کسی قسم کی چشم دید یا واقعاتی شہادت موجود نہ تھی، ان سے متعلق سوالات اور جرح کے دوران میں ان کے خاندان اور قبیلے والوں نے بھی یہی کہا کہ یہ ہمارے اچھے اور بھلے لوگوں میں سے ہیں۔ لیکن وہ چونکہ اصرار کے ساتھ اپنے اقرار پر قائم رہے اس لیے بالآخر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں رجم کیے جانے کا فیصلہ صادر فرمایا۔ اس کے بعد جب انہیں رجم کیا جا رہا تھا تو کچھ دیر تک اپنے پاؤں پر کھڑے رہنے کے بعد وہ بھاگ نکلے اور انہوں نے چند باتیں بھی ایسی بیان کیں کہ جن سے ارتکاب جرم کے معاملے میں کچھ اشتباہ و التباس کا امکان پیدا ہو جاتا تھا۔

چنانچہ حضرت جابر بن عبداللہ سے ابوداؤد اور دیگر کتب حدیث میں مروی ہے:۔

كنت فيمن رجم الرجل انا - لما خرجنا به فرجمناه فوجد مس الحجارة صرخ بنا - يا قوم ردوني الى رسول الله صلى الله عليه وسلم فان قومي قتلوني وغروني من نفسي واخبروني ان رسول الله صلى الله عليه وسلم غير قاتلي........

(میں ان لوگوں میں شامل تھا جنہوں نے حضرت ماعزؓ کو رجم کیا تھا۔ ہم انہیں لے کر نکلے اور ان پر پتھر پھینکنے شروع کر دیے۔ جب انہوں نے ان کی چوٹ محسوس کی تو چیخ کر ہم سے کہنے لگے "اے لوگو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لوٹا کے لے جاؤ۔" میری قوم نے مجھے قتل کرایا اور مجھے اپنے معاملے میں دھوکہ دیا اور انہوں نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے قتل نہیں کریں گے)۔

اس طرح کی دوسری احادیث بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ماعزؓ نے بھاگنے اور سزا سے بچنے کی کوشش کی، نیز وہ یہ چاہتے تھے کہ انہیں حضور نبوی میں ایک مرتبہ پھر پیش ہونے اور اپنے بارے میں مزید وضاحت یا صفائی کا موقع دیا جائے۔ یہ ان کا ایک لحاظ سے اپنے سابق اقرار جرم سے قولی و عملی رجوع تھا یا کم از کم وہ اپنے بیان میں کوئی تبدیلی یا اضافہ کرنا چاہتے تھے اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تفصیلات سن کر فرمایا کہ تم نے اسے چھوڑ کیوں نہ دیا، یعنی اسے میرے پاس آکر دوبارہ بیان کا موقع کیوں نہ دیا؟ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ آنحضورؐ رجم کی سزا کو روک دیتے۔ آخری فیصلہ تو ان کی توضیح و تکمیلی گذارش سن کر ہی ہوتا اور نہ معلوم کیا ہوتا لیکن آنحضورؐ نے بہر حال انہیں صفائی و بیان کی آخری مہلت

دینا ضروری خیال فرمایا۔ حضرت جابرؓ کی جو حدیث اُوپر نقل ہوئی ہے، اُس کے آخر میں وہ خود فرماتے ہیں۔

قال فهلا ترکتموه وجئتمونی به لیستثبت رسول الله صلی الله علیه وسلم منه فاما ترك حد فلا۔

(آنحضورؐ کا یہ ارشاد کہ "اسے چھوڑ کیوں نہ دیا اور میرے پاس کیوں نہ لائے" یہ محض اس لیے تھا کہ آنحضورؐ اس سے دوبارہ تحقیق و تفتیش فرمائیں۔ اس سے لازم نہیں آتا کہ حد ترک کر دی جاتی)۔

ہمارے نزدیک اس واقعہ کی صحیح توجیہہ و تاویل یہی ہے۔ اس سے یہ بھی استنباط کیا جا سکتا ہے اور فقہاء و ائمہ کی اکثریت نے کیا ہے کہ اگر مجرم کے خلاف مزید کوئی شہادت نہ ہو اور وہ اقرارِ جرم کر کے اس سے پھر جائے تو اس پر سے حدود و قصاص کی بدنی سزا ساقط ہو جائے گی۔ کیوں کہ اقرار کے بعد اس سے رجوع بہر حال شک و شبہ پیدا کر دیتا ہے جس سے فوجداری سزاؤں کا نفاذ رک جاتا ہے۔

دوسری روایت جس کے متعلق آپ نے پوچھا ہے وہ حضرت ابوالدرداءؓ کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک عورت لائی گئی جو چوری کے جرم میں ماخوذ تھی تو آپ نے دریافت فرمایا۔ کیا تو نے چوری کی ہے؟ کہدے کہ نہیں۔ یہ روایت بعض محدثین کے نزدیک شاید مرفوع ہو، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک اس کی سند پہنچتی ہو، لیکن اکثر محققین و ناقدین حدیث کے نزدیک یہ روایت حضرت ابوالدرداءؓ ہی تک موقوف ہے، اس سے اُوپر اس کی سند صحیح نہیں۔ حافظ ابن حجر التلخیص الحبیر، کتاب الحدود میں فرماتے ہیں:

وقوله قل، لا لم یصححه الائمة، فیبقی اللفظ علی صحته قوله ما اخالك سرقت۔

(نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس قول کی نسبت کو ائمہ حدیث نے صحیح تسلیم نہیں کیا کہ "کہہ دے، میں نے چوری نہیں کی۔" باقی الفاظ جن کی صحت ثابت ہے وہ آنحضورؐ کا فقط یہ ارشاد ہے کہ میں نہیں سمجھتا کہ "تو نے چوری کی ہو گی۔")

سنن بیہقی کا حوالہ قاضی بشیر احمد صاحب نے سبل السلام سے دیا ہے جو حافظ ابن حجرؒ کی کتاب بلوغ المرام کی شرح ہے۔ اس وقت سبل السلام یا سنن بیہقی تو سامنے نہیں، لیکن حافظ ابن حجر نے تلخیص کے اسی مقام پر جن الفاظ میں اس روایت کو نقل کیا ہے، اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیہقی نے بھی اسے مرفوعاً روایت نہیں کیا۔ حافظ موصوف کے الفاظ ہیں۔ قد رواہ البیھقی موقوفاً علی ابی الدرداء۔ حافظ ابن حجرؒ نے خود بلوغ المرام، حد السرقہ میں صرف یہ حدیث درج کی ہے کہ ایک چور آنحضورؐ کی خدمت میں لایا گیا جس کے پاس سے مال مسروقہ نہیں پایا گیا تو آنحضورؐ نے فرمایا۔ ما اخالك سرقت (میرا خیال نہیں ہے کہ تو نے چوری کی ہوگی)۔ یہ ایک دوسری حدیث ہے جو مختلف صورت سے متعلق ہے اور اس کے الفاظ بھی وہ نہیں جو حضرت ابوالدرداء والی روایت میں منقول ہیں۔ بہرکیف ہمارے نزدیک کسی چور سے آنحضورؐ کا یہ کہنا ثابت نہیں کہ تو کہہ دے کہ میں نے چوری نہیں کی۔ چوری کے جس ملزم کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ میں نہیں سمجھتا تو نے چوری کی ہوگی، اس سے چوری کا مال بھی برآمد نہیں ہوا تھا اور اس کے خلاف کسی شہادت کا ذکر بھی نہیں ملتا۔ ہوسکتا ہے کہ محض مدعی کے کہنے پر اسے پکڑا گیا ہو

اب آپ کا صرف ایک اشکال باقی رہ جاتا ہے کہ ترجمان القرآن (ماہ جنوری، صفحہ ۳۲) میں شہادت کی میعاد (LIMITATION) کی جو تشریح کی گئی ہے اور پردہ پوشی وغیرہ کی جو ہدایت کی گئی ہے اس سے بھی جرائم کو شہ ملے گی۔ اس پر اگر تفصیلی کلام کیا جائے تو بحث جو پہلے ہی خاصی لمبی ہو چکی ہے، اس کی طوالت میں مزید اضافہ ہوگا۔ سردست مختصراً اتنی بات پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ صاحب مضمون نے اپنی تالیف، بالخصوص اس کے متن کی بنیاد حنفی فقہ پر رکھی ہے۔ دوسرے مسالک سے زیادہ تعرض نہیں کیا۔ اس لیے اس مضمون میں جو فقہی مسائل و جزئیات درج کیے گئے ہیں ضروری نہیں کہ جملہ ائمہ و فقہا کا ان پر اتفاق و اجماع ہو۔ ہمارے ملک کے اہل علم مل جل کر ان پر دوبارہ غور کر سکتے ہیں۔ مثلاً یہی جزئیہ لیجیے کہ چوری، شراب نوشی اور زنا کے مقدمات میں شہادت کے قابل سماعت و قبولیت ہونے کے لیے ضروری ہے کہ گواہ عدالت میں صدور جرم سے ایک ماہ کے اندر شہادت دے، الا یہ کہ وہ کوئی معقول عذر تاخیر کے لیے پیش کرے۔ آج کل پولیس کی تفتیش، چالان اور عدالتی کارروائی کے لیے جو نظام رائج ہے اس میں شہادت کی میعاد کے لیے ایسی قید

حصولِ انصاف میں رکاوٹ کا باعث بن سکتی ہے۔ پھر اس مسئلے کا تعلق محض ضابطہ کار (PROCEDURE) سے ہے اور اس میں ردّ و بدل کی گنجائش موجود ہے۔ اس میں خود فقہائے حنفیہ کے اقوال مختلف ہیں۔ مثال کے طور پر ردالمحتار، کتاب الحدود، باب الشہادت علی الزنا میں بھی لکھا ہے۔

اعلم ان التقادم عند الامام مفوض الی رأی القاضی فی کل عصر۔

(معلوم ہونا چاہیے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک شہادت کی میعاد سماعت اور اس کا زائد المیعاد ہونا ہر زمانے میں جج کی رائے پر موقوف ہے)۔

اسی طرح مضمون میں مجرم کی پردہ پوشی کو جس طرح اس کے خلاف شہادت پر افضل قرار دیا گیا ہے اور ایک ماہ کے بعد گواہی دینے والے گواہ کو جس طرح فاسق و ناقابل قبول قرار دیا گیا ہے یہ بات بھی محل نظر ہے اور اسے علی الاطلاق صحیح قرار دینا مشکل ہے۔ بلاشبہ حدیث میں مسلمان کی پردہ پوشی کی تلقین فرمائی گئی ہے مگر اس اصول کو ہر جرم اور ہر مجرم پر یکساں چسپاں نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ بعض صورتیں ایسی ہوتی ہیں جب نصابِ شہادت کی تکمیل ممکن نہیں ہوتی، مثلاً حدِ زنا کے اجراء کے لیے چار گواہ ضروری ہیں مگر زنا ایک ہی گواہ کے سامنے سرزد ہوتا ہے اور کچھ معلوم نہیں کہ زانی اقرار جرم کرے گا یا نہیں۔ ایسی صورت میں ایک گواہ کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ ستر پوشی اور کفِ لسان سے کام لے ورنہ اشاعتِ فاحشہ کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہر جگہ ہر جرم پر پردہ ڈالنا مداہنت اور کتمانِ شہادت کے مترادف ہے جس کی مذمت کتاب و سنت کے دیگر نصوص میں وارد ہے۔ خود فقہائے حنفیہ نے میعادِ شہادت کے لیے جو حد مقرر کی ہے، اس سے وہ جرم قذف کے خلاف شہادت کو مستثنیٰ کرتے ہیں کیونکہ اس میں ان کے نزدیک حق العباد بھی شامل ہے۔ حالانکہ دوسرے فوجداری جرائم سرقہ، زنا کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اُن کی ایک جہت حقوق العباد سے متعلق ہے۔ چنانچہ ہدایہ کے جس مقام سے یہ عبارت نقل کی گئی ہے وہیں یہ تصریح موجود ہے کہ امام شافعی رحمۃ اللہ کی اس معاملے میں رائے مختلف ہے۔ وہ ان جرائم کو خالصتاً حقوق اللہ کی پامالی نہیں قرار دیتے بلکہ ایک پہلو سے انہیں حقوق العباد سے بھی متعلق سمجھتے ہیں اور اسی لیے وہ اس تقادم یعنی شہادت کے زائد از میعاد ہو جانے کے

قائل نہیں۔ اس بارے میں صرف امام شافعی ہی نہیں بلکہ دوسرے فقہاء بھی احناف سے اختلاف رکھتے ہیں۔ علامہ عبدالرحمٰن الجزیری اپنی کتاب الفقہ علی المذاہب الاربعہ، جلد ۵، کتاب الحدود صفحہ ۳۰، میں عدم التقادم فی اداء الشہادۃ (شہادت میں میعاد کا مقرر نہ ہونا) کے زیر عنوان فرماتے ہیں۔

المالکیہ والشافعیہ والحنابلہ قالوا۔ ان الشہادۃ فی الزنا وفی حد القذف وشرب الخمر تسمع بعد مضی زمان طویل من الواقعہ۔ ذالک لان الحد بعد الشہادۃ اصبح حقا ولم یثبت ما یبطلہ۔

(مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ اس کے قائل ہیں کہ زنا، قذف اور شرب خمر میں واقعہ جرم پر طویل زمانہ گذر جانے کے بعد بھی شہادت قابل سماعت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شہادت کے بعد حد کا نفاذ ایک قانونی حق ہے اور ہمارے نزدیک کوئی ایسی دلیل ثابت نہیں جو اس حق کو باطل کر سکے)۔

محترم جنرل صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ:-

"میری درخواست پر سعودی عرب کے شاہ خالد بن عبدالعزیز اور مصر کے صدر انورالسادات نے اپنے مذہبی امور کے مشیر بھیجنے کا وعدہ کیا ہے - اُن کے ساتھ ہی الجامعۃ الازہر کے شیخ بھی تشریف لا رہے ہیں اور وہ اسلامی قوانین مرتب کرنے میں ہماری مدد کریں گے"

اِس اقدام کی بہت سی برکات ہو سکتی ہیں، مگر جہاں تک قانون سازی یا عملی زندگی کے متعلق فقہی و مذہبی جزئیات کو طے کرنے کا تعلق ہے، زیادہ مفید کام وہی اہل علم کر سکتے ہیں جو ایک معاشرے کے مجموعی حالات، اس کے مخصوص مذہبی رجحانات، اس میں رائج شدہ صحیح اور غلط تصورات، یہاں کی عادات اور یہاں کے معروفات کو اچھی طرح جانتے ہوں۔ پھر اس کام کو یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ جو بھی قانون سازی کی جائے یا فقہی اُمور میں جو بھی فیصلے دیے جائیں اُن کو عوام کے سامنے اُن کی ذہنی کیفیات کو مدِ نظر رکھ کر اس طرح لایا جائے کہ وہ مطمئن ہو سکیں - یہ کام بھی یہیں کے علماء و عمائد زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔

ساتھ ہی یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ اعلیٰ رُتبہ رکھنے والے باہر سے آمدہ اکابرین کے لیے یہ تو ممکن نہیں کہ وہ قانون کے لمبے کام میں کچھ زیادہ وقت دے سکیں - اُن سے صرف اتنی ہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اسلامی کونسل یا اُس کی خاص کمیٹیوں کو اپنے مشورے دے سکیں۔

خوش قسمتی سے عربی زبان میں الفقہ علی المذاہب الاربعہ شائع ہو چکی ہے جس میں ہر عنوان اور ہر مبحث سے متعلق چاروں فقہوں کی آرا یکجا دی ہوئی ہیں - اس سے پہلے بدایۃ المجتہد موجود تھی جس میں اختصار سے بتایا گیا ہے کہ مختلف مسائل میں نصوص کے کن اشارات اور دلالتوں کی بنا پر فقہائے اربعہ نے الگ الگ مسلک اختیار کیے۔ یہ کتاب ہر مسئلے میں اتفاقِ رائے کی حد کو بھی متعین کرتی ہے اور پھر اختلاف کے وجوہ کو بھی۔ علاوہ ازیں دورِ جدید میں اور بہت سی کوششیں ہو چکی ہیں - تازہ ترین کام الکویت میں ہو رہا ہے - جہاں فقہ اسلامی کا انسائیکلو پیڈیا تیار کیا جا رہا ہے اور اس کے بعض اجزا شائع ہو چکے ہیں۔

اس طرح کا علمی سرمایہ اگر اسلامی کونسل کے سامنے ہو اور وہ تیز رفتار سے کام کرنے کا تہیہ کر لے تو ایسی کوئی مشکل نہیں ہے جو لاینحل ہو، یا جس کی وجہ سے اس ضروری کام کو مزید کئی برسوں

تک پھیلا دیا جائے۔

عوام میں اسلامی نظامِ قانون و عدالت کے لیے ایک طلب موجود ہے۔ اس طلب کے ہوتے ہوئے تدوین و نفاذ قانون کی منزل طے ہو جانی چاہیے، ورنہ اگر نادیہ قانون کے دفتر تیار ہوتے رہے اور اس دوران میں سیکولر عناصر کی مداخلتوں سے عوام کی طلب ہی ٹھنڈی پڑ گئی تو پھر قانون کے دفتر کس کام آئیں گے۔

اپنی اسی طویل تقریر میں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جناب جنرل محمد ضیاء الحق نے یہ بھی فرمایا ہے کہ:

> "مثلاً اگر تعلیمی نظام ہی کو اسلامی رنگ میں رنگنا چاہیں تو اس سلسلے میں محض قانون بنا دینا کافی نہیں ہوگا بلکہ نصابی کتابوں کی تیاری، اساتذہ کی تربیت، والدین اور ان کے بچوں کی تربیت اور رضا بھی لازمی ہے....."

ریڈیو سے تقریر کے یہ الفاظ سنتے ہی مجھے خیال آیا کہ کیا افغانستان میں نور محمد ترہکی کی حکومت نے بھی نظام تعلیم کے متعلق اسی طرح سوچا ہوگا، یا دیگر جن ممالک میں کمیونسٹ انقلاب لا کر معاشرے کے ہر شعبے میں تبدیلی لانا شروع کرتے ہیں تو کیا ان کا نقشۂ کار ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیا وہ یوں سوچتے ہیں کہ پہلے دو تین سال میں نصاب تیار کیا جائے پھر اساتذہ کی تربیت کا انتظام کیا جائے، پھر والدین اور ان کے بچوں میں نئے نظامِ تعلیم کے متعلق رضامندی اور خواہش پیدا کی جائے؟

اصل میں انقلابی عزائم کے ساتھ جو لوگ سوچ سمجھ کر اور کام کا نقشہ بنا کر آگے آتے ہیں، وہ ہر دائرے میں تبدیلی کے پروگرام کو دو تین مراحل میں تقسیم کرتے ہیں۔ اوّلاً فوری اقدامات[1]، ثانیاً عبوری مرحلے کے لیے اسکیم اور ثالثاً مستقل معیاری لائحہ عمل۔

---

[1] فوری اقدامات ایسے ہوتے ہیں جن سے چند اہم علامتی تبدیلیاں بر پا کر دی جائیں جو اچھی طرح محسوس ہوں اور جن کے ذریعے ہر کسی کو اندازہ ہو جائے کہ اب یہاں گاڑی فلاں سمت میں چلے گی۔

ورنہ اگر وہ تعلیم یا کسی دوسرے شعبے کے احوال کو تین چار سال کے لیے اس بنا پر یونہی چھوڑ دیں کہ پہلے ضروری تیاری کر لی جائیں، تو ان کا تو تختہ الٹ جائے۔

تبدیلی لانے والی حکومتیں یا قیادتیں ابتدائی مرحلے کے لیے یہ دیکھتی ہیں کہ مثلاً کیا کچھ نصابی مواد لکھا لکھایا مل سکتا ہے؟ کتنے استاد نئے نقشے پر کام کرنے کے اہل ہیں اور کتنے افراد دوسرے اُردو سے اس شعبے میں لائے جا سکتے ہیں۔ پھر وہ موجودہ سروسامان کے بل پر کام شروع کر دیتے ہیں اور آگے بڑھنے کے لیے مزید سروسامان کی فراہمی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔

تبدیلی کا عمل پہلے دن ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اور جہاں ایسا نہ ہو وہاں کوئی بھرپور اور نتیجہ خیز تبدیلی کبھی آ ہی نہیں سکتی۔

ہماری مملکت کو چلانے والی شخصیت کے ان الفاظ کو پڑھ کر یہ گمان ہوتا ہے کہ اُن کو اہم ترین مسائل میں مشورہ دینے والے لوگ بیوروکریسی کی سطح سے بلند تر نہیں ہیں۔ بیوروکریسی میں ایک بڑی کمی تخلیقی رجحان کی ہوتی ہے۔ وہ کسی تبدیلی کے لیے مشکل ہی سے ایسا موثر نقشہ تجویز کر سکتی ہے جس پر دینی و سیاسی اکابر بھی مطمئن ہوں، تعلیم (یا کسی دوسرے شعبے کے) کارپرداز بھی اس انقلابی عمل کی حکمت کو بخوبی سمجھ لیں جس کا آغاز ہو رہا ہے۔ اور عوام میں بھی نئی سمت سفر میں حرکت کرنے کا جذبہ جاگ اُٹھے۔

اُوپر کے الفاظ بیوروکریسی کے مخصوص ذہن کے آئینہ دار لگتے ہیں۔ کیونکہ بات ایسے انداز سے سامنے آتی ہے کہ اب اگر نظامِ تعلیم کی کسی تبدیلی میں برسوں کی مدت بھی لگ جائے تو یہ برحق ہوگا۔

مجھے یاد ہے کہ جب آزاد کشمیر میں سردار عبدالقیوم صاحب کی حکومت قائم ہوئی تھی تو انہوں نے مختلف اشخاص اور اداروں سے پوچھا کہ نظامِ تعلیم کو کس طرح تبدیل کیا جائے۔ یہ سوال مجھ تک بھی پہنچا۔ میں نے اس کے جواب میں بعض دوسرے اصحاب کے مشورے سے ایک مقالہ لکھا کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں تبدیلی کیسے لائی جائے۔ اس میں مَیں نے فوری اور عبوری مرحلے کے لیے ایک لائحہ عمل دیا تھا، جس میں نصابیات اور اساتذہ جیسے بڑے مسائل کا حل بھی تجویز کیا گیا تھا۔

میری درخواست اپنی مملکت کے کارپرداز جناب محمد ضیاء الحق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سے یہ ہے کہ اگر واقعی وہ اسلامی نظامِ تعلیم کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں (اور بظاہر وہ صدقِ دل سے ایسا

جا سکتے ہیں) تو حالیہ تقریر کے محولہ بالا جملے سے وہ ذرا آگے بڑھیں، اور ایسا موقع باقی نہ رہنے دیں کہ مخالف یا غلط الفکر یا ناکارہ عناصر اس جملے کو اپنے تاخیری اور التوائی ذوق کی تسکین کا ذریعہ بنالیں۔ وہ اپنے ذاتی جذبۂ ایمانی اور اسلامی کونسل کے اراکین اور ملک کے دوسرے قابل اعتماد مفکرین کے مشوروں سے کام لے کر نظام تعلیم کے لیے فوری اور عبوری مرحلے کا پروگرام پہلے طے کریں اور اس کا اعلان بھی کریں۔ اور اس کے نفاذ کے لیے تیز رفتار عملی اقدامات کا آغاز کردیں۔ وہ انقلابی لیڈروں کے مقام سے تبدیلی کی لہریں عملاً اٹھانے کی کوئی راہ نکالیں۔

ورنہ تاخیر پسند اور التوا پسند عناصر تو روز نئے نئے معقول بہانے تیار کرکے پیش کرتے رہیں گے۔ اور آپ کو عملاً ضروری اقدامات کا موقع نہ دیں گے۔

خدا کرے کہ آپ ایسے عناصر کے گھیرے میں کبھی نہ آئیں۔

اسلامی سزاؤں کے متعلق جو اصولی بات چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے کہی ہے۔ میں بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے اوپر کی ایک گذارش کو دوہراتا ہوں۔ وہ یہ ہے کہ اسلامی نظام چند متفرق اجزاء کا نام نہیں ہے۔ یہ تو ایک مشینری کی طرح سے مکمل چیز ہے اور سارے پرزے اپنی اپنی جگہ پر ہونے ہی سے یہ چلتی ہے۔

لیکن اس وقت جس طرح دیگر بہت سی سزائیں بغیر اسلامی حوالے کے رائج ہیں (اور بعض صورتوں میں پہلے بھی تازیانوں کی سزا دی جارہی ہے) اگر چند سالوں سے بڑھتی ہوئی رفتارِ جرائم کو روکنے کے لیے کوڑوں کی سزا یا کوئی دوسری سزا حکومت نافذ کرے تو کونسی چیز اسے روک سکتی ہے۔ کوڑوں کی سزا کو وہ بطور اسلامی حد کے جاری نہ کرے اور اسلامی حد کے لحاظ سے تو اب تک شرائط پوری ہو بھی نہیں رہیں۔

چوری اور خیانت کو روکنے کے لیے کسی دوسری سزا کے ساتھ اگر خیانت کردہ یا مسروقہ مال مجرم سے واپس لینے یا اس کی جائیداد سے وصول کرنے کا ضابطہ رائج کردیا جائے تو خرابیٔ احوال میں کمی آسکتی ہے۔

چیف مارشل ایڈمنسٹریٹر کسی وقت سعودی عرب سے یہ دریافت کرائیں کہ وہ زمانہ جب بدو حاجیوں کے قافلوں کو لوٹتے تھے، کس طرح تبدیل ہو کر ان حالات تک پہنچا کہ کھلی پڑی چیزوں کو بھی کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔

پورا اسلامی نظام آنے سے پہلے بھی بہت سے کام کیے جا سکتے ہیں، جو اسلام کے نفاذ کے لیے راستہ ہموار کریں۔

محترم جنرل محمد ضیاء الحق نے اپنی تقریر میں ایک محدود صورت میں زکوٰۃ کا تجربہ کرنے کا اعلان بھی کیا ہے یعنی صاحبِ حیثیت لوگ رضاکارانہ طور پر زکوٰۃ دیں گے اور حکومت اس رقم کو منظم طور پر جمع کر کے اسلامی قوانین کے مطابق معاشرے کی بہبود کے لیے خرچ کرے گی۔ اس سلسلے میں غرباء، یتمٰی، مساکین اور بیوائیں سرفہرست ہوں گی۔

خاصا قابلِ غور موضوع ہے۔

ایک بات تو یہ سامنے رہنی چاہیے کہ مملکتِ خداداد پاکستان میں ایک بار پہلے بھی رضاکارانہ جذبے سے زکوٰۃ دینے والوں کے لیے حکومت نے بنکوں میں زکوٰۃ فنڈ کا اجرا کیا تھا۔ مگر اس میں آمدنی اتنی برائے نام ہوئی کہ تجربہ ناکام ہو گیا۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس کام کے لیے اگر کوئی محکمہ کھولا گیا تو محدود پیمانے پر آنے والی زکوٰۃ کا ایک بڑا حصہ سرکاری کارکنوں اور دفتروں پر خرچ ہو جائے گا۔

اسی طرح تیسرا معاملہ یہ اہم ہے کہ آخر کن طریقوں سے زکوٰۃ صحیح مستحقین تک پہنچے گی۔ آپ اگر اختیارات انتظامی افسروں کو دیں گے تو اکثر افسر اپنے آدمیوں کا خیال رکھیں گے اور سیاسی یا مذہبی لحاظ سے مخالف عناصر کو نظر انداز کریں گے۔ مثلاً اس وقت پیپلز پارٹی کے افسروں کی بڑی تعداد موجود ہے۔ ان میں سے بہت کم مذہب پسندی یا خداخوفی کا رنگ رکھتے ہیں۔ کیا ان سے بعید ہو گا کہ وہ زکوٰۃ کی تقسیم ایک خاص انداز سے کرائیں۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ پہلے سے فہرستیں تیار کرائی جا سکتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ فہرستیں کون تیار کرے گا؟ اگر افسران کریں گے تو بات وہی ہوئی۔ اگر آپ کہیں کہ ہماری یونین کونسلیں یا اصلاحی کمیٹیاں کریں گی تو پھر یہ سوال لازماً زیرِ غور آئے گا کہ ان کونسلوں اور کمیٹیوں کے ممبروں اور ان کی سابق خدمات کے متعلق لوگوں کی رائے کیا ہے۔ بہت سے مراسلات اس موضوع پر اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔

اب اگر وصولیٔ زکوٰۃ یا تقسیم زکوٰۃ میں ایک مرتبہ مختلف مقامات پر غلط مثالیں سامنے آگئیں تو پھر لوگوں میں ادارۂ حکومت پر یہ اعتماد نہیں رہ سکے گا کہ اس کے ذریعے زکوٰۃ صحیح جگہوں تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ خیال رہے کہ پہلے بھی یہ اعتماد موجود نہیں تھا۔

زکوٰۃ کا تجربہ شروع کرتے ہوئے ہزار بار سوچیے کہ فی الوقت اسے محض اہل ثروت کے رضاکارانہ جذبات پر اعتماد رکھتے ہوئے ہاتھ میں لینا چاہیے یا نہیں۔

اس طرح کے نکات بہت سے ہیں۔ اِن اوراق میں سب پر گفتگو کرنا ممکن نہیں۔ میں جناب مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے اس خوش آئند جملے کو درج کرتے ہوئے قلم روک رہا ہوں کہ:

"اسلام ایک نہایت مہذب، نرم مزاج اور معتدل دین ہے۔ اس کے رفاہی پہلو اس کے تعزیری پہلوؤں سے کہیں زیادہ ہیں۔"

تفہیم القرآن — جلد ششم

کا

نیا ایڈیشن

عُمدہ کتابت وطباعت اور جلد سازی کی جملہ خوبیوں
سے آراستہ ہو کر تیار ہے
تاجران کتب اور قارئین کرام اپنی مطلوبہ تعداد کیلیے
پہلی فرصت میں اپنے آرڈر سے ہمیں مطلع فرمائیں

ہدیہ:- ۴۲/- روپیے